انوشا اِمراوتی محل میں

انوشا کی آپ بیتی

آٹھواں حصّہ

انوشا امراوتی محل میں

بچوں کے لئے ناول

محمد یونس حسرت

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

پہلی بار ۱۹۷۹

تعداد ۴۰۰۰

قیمت ۴۔۰۰

فہرست

پَرورپور میں

مجُھے پَرورپور میں واپس آئے تیس سال ہو چلے تھے۔

اپنی ماں کے مرنے کے بعد جب میں پشکلاوتی سے پَرورپور کے لیے روانہ ہوا تھا تو اُس وقت میرا خیال تھا کہ اب میری زندگی اپنی خالہ کے قدموں میں ہی بسر ہو گی۔ لیکن پَرورپور پہنچنے کے چند روز بعد ہی سارنگ بابا نے مجُھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور پھر میں اُن کا چیلا بن کر اُن کے ساتھ ہو لیا تھا۔ اپنے ساتھ وہ مجُھے کیسر

ناگ کے جنگل تک لے گئے تھے اور اُنہوں نے مُجھے وہ کُچھ بنا دیا تھا جس کا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ اور پھر تقدیر کا زبردست ہاتھ ہمیں کُچھ اِس طرح راجاؤں کی دُنیا میں لے گیا تھا کہ میں اور سارنگ بابا راجاؤں کے تماشے کی کٹھ پُتلیاں بن کر رہ گئے تھے۔ اس سارے عرصے میں میری خالہ بڑے صبر اور حوصلے سے میری واپسی کا انتظار کرتی رہی تھی۔ اِسی لیے پَرور پور میں واپس آنے کے بعد میری خواہش اور کوشش یہی تھی کہ دِن رات اپنی خالہ کی خدمت میں لگا رہوں اور اِس طرح اپنی پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کروں۔

اُوشا کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اپنی ماں سے کہیں زیادہ میری خالہ کی خدمت کر کے خوش ہوتی تھی۔ اُس کی ماں کے لیے تو یہی خوشی بہت بڑی تھی کہ اُسے اپنی بیٹی زندہ سلامت واپس مل گئی تھی، جسے اُس کے باپ نے نجومیوں کے کہنے پر پیدا ہوتے ہی دریائے سندھ کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔

اُن تیس برسوں میں میرے ارد گرد بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ پَرور پور

کے محل میں راجا رام کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا رتن راج گدی پر بیٹھ گیا تھا۔ میری خالہ کے شوہر کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اُس کا ایک بھتیجا تکشک ناگ کے مندر کا پروہت بن گیا تھا۔ بچّے جوان ہو گئے تھے۔ جوان بوڑھے ہو گئے تھے اور بوڑھے اِس دُنیا سے رُخصت ہو گئے تھے۔

مگر خود میری ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میرے لیے جیسے وقت کی رفتار کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اتنے برس گُزر جانے کے باوجود میں اب بھی وہی تیرا چودہ سال کا لڑکا نظر آتا تھا، جو سارنگ بابا کے ساتھ پَرور پور سے کیسر ناگ کے جنگل تک گیا تھا، میں نے شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت موریہ کی خاطر ٹیکسلا سے پاٹلی پُتر کا رُخ کیا تھا، پھر شیش ناگ کے بیٹے کے ہاتھوں سلیوکس کی شکست کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کیسر ناگ کے ہیروں کا تحفہ شیش ناگ کے بیٹے کی نذر کیا تھا۔ اتنے سال گزرنے پر بھی میں بالکل ویسا ہی تھا اور میرے گلے میں جھولتا ہوا میرا دودھ شریک بھائی شانی بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ یہ سب سارنگ بابا کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ جنھوں نے مجھے کتنی ہی پُر اسرار

طاقتوں کا مالک بنا دیا تھا اور جو اب کوہ شوالک کے دامن میں شیل شر نگن کی پہاڑی پر اپنے گرونا گیسن کی اُسی طرح خدمت کر رہے تھے جس طرح میں پَرور پور میں اپنی خالہ کی خدمت کر رہا تھا۔

اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ بات کُچھ میرے اور شانی کے ساتھ ہی خاص نہ تھی۔ اتنے سال گُزر جانے کے باوجود اُوشا اور اُس کا پالتو سانپ امبر دونوں ویسے ہی تھے جیسے کہ میں نے انہیں پہلی بار راجا پورس کے دربار میں دیکھا تھا۔

سارنگ بابا ہمیں پَرور پور میں چھوڑ کر خود شیل شر نگن کی پہاڑی کی طرف چلے گئے تھے، لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ کو اُن سے جُدا محسوس نہیں کیا تھا۔ وقت اور فاصلے کی بات تو میرے لیے ویسے ہی کُچھ معنی نہیں رکھتی تھی۔ میں جب چاہتا، اُن کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اپنی خالہ کے ہاتھ تھامے ہوئے میں آنکھیں بند کرتا تو اپنے آپ کو شیل شر نگن کی پہاڑی پر سارنگ بابا کے قدموں میں پاتا۔

پھر ایک شام میری خالہ بیمار ہو گئی۔ بالکل اُس طرح جس طرح کبھی میری ماں بیمار ہوئی تھی۔ وہ ذرا دیر کے لیے ہوش میں رہتی اور پھر بے ہوش ہو جاتی۔ کُچھ دیر بے ہوش رہنے کے بعد اُسے ہوش آتا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے کی نسبت کمزور ہو چکی ہے۔ ایک بار وہ ہوش میں آئی تو اس نے میرے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا:

"انوشا بیٹے! تُم نے اتنے سال میری خدمت کی ہے۔ میں تُم سے خوش ہوں، بہت خوش ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئی۔ خاصی دیر بعد جب وہ ہوش میں آئی تو اُس کے ہونٹوں پر ایک کمزور سی مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کہا:

"انوشا بیٹے! میں نے ابھی ابھی تمہاری ماں کو دیکھا ہے۔ وہ تُم سے بہت خوش ہے۔ وہ مُجھ سے کہہ رہی تھی کہ تُم نے بہت آرام کر لیا، بہن۔ اب تُم میرے پاس چلی آؤ اور انوشا کو اُس کے باپ کے پاس واپس بھیج دو!"

”باپ کے پاس!“ میں نے حیرانی سے کہا۔ ”میرا باپ کہاں ہے؟ اُسے تو مرے ہوئے پچاس سال سے اوپر ہو گئے ہیں، اگر وہ زندہ ہوتا، تب بھی میں ایک بیٹے کی حیثیت سے اُس کے پاس نہ جاتا۔ میں تو اُس کے لیے جیتے جی مر گیا تھا۔ اُس نے تو مجھے اور میری ماں کو ذلیل کر کے راج محل سے نکال دیا تھا، صرف اِس لیے کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج محل میں رہنا اور راج گدی پر بیٹھنا انوشا کی قسمت میں نہ تھا۔۔۔ اور میرے جس سوتیلے بھائی کی قسمت میں راج محل میں رہنا اور گدّی پر بیٹھنا لکھا تھا، اُس نے اُس کا سر کاٹ کر چندر گُپت موریہ کو پیش کیا تھا۔۔۔ میں اُس کے پاس جاؤں؟ کہاں جاؤں؟ کہاں ہے وہ راج محل؟ کہاں ہے وہ راج گدّی؟“

لیکن مجھے خالہ کی طرف سے اپنی بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ پھر بے ہوش ہو گئی تھی، اور اِس بے ہوشی کے بعد اُسے دوبارہ ہوش میں آنا نصیب نہ ہوا۔ صُبح ہونے تک وہ اِسی بے ہوشی کے عالم میں اِس دُنیا سے رُخصت ہو چکی تھی۔

خالہ کی موت سے میرے دِل میں اپنی ماں کی موت کا زخم پھر ہرا ہو گیا اور میں اس کے بے جان جسم سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رویا۔ لیکن اس حالت میں بھی میرا دماغ اُن الفاظ پر غور کر رہا تھا جو خالہ نے مُجھے کہے تھے۔ وہ الفاظ جو خالہ کے آخری الفاظ تھے اور جو اُس کے کہنے کے مطابق میری ماں نے اُس سے کہے تھے۔ میری ماں نے جو خالہ سے یہ کہا تھا کہ انوشا کو اُس کے باپ کے پاس واپس بھیج دو، اس کا کیا مطلب ہے؟

میں تو دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا لیکن اُوشا اور اُس کی ماں کے چہرے ایک عجیب اور پُر اسرار قسم کے سکون کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ جیسے اُنہیں پہلے سے خالہ کی موت کی توقع ہو۔ جیسے اُنہیں قُدرت کی طرف سے اِس کی خبر پہلے ہی سے مل چکی ہو۔

اور واقعی اُنہیں اِس کی خبر پہلے سے مل چکی تھی۔ صرف یہی ایک بات نہیں، قُدرت کی طرف سے انہیں اور بہت کُچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اس کا کُچھ کُچھ اندازہ

مجُھے اُن واقعات سے ہوا جو خالہ کی موت کے بعد پیش آئے۔

ٹیکسلا جاؤ

رتن جب راج کُمار تھا تب بھی اُسے دو باتوں کا شوق تھا۔ ایک شکار کھیلنا اور دوسرے بانسری بجانا۔ اور جب وہ راجا رام کے مرنے کے بعد راجا بن کر پَرور پور کی راج گدی پر بیٹھا، تب بھی اُس کی اِن دونوں دلچسپیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ اُس کے یہ شوق پہلے سے کہیں بڑھ گئے۔ یہ انہی دلچسپیوں کا نتیجہ تھا کہ ایک بار وہ شکار کی مہم سے واپس آیا تو بانکا مُرلی والا اُس کے ساتھ تھا۔ یہ وہی بانکا مُرلی والا تھا جس کے جسم میں سارنگ بابا نے اُس کی بانسری کے عاشق سانپ کی

جان ڈالی تھی اور اِس طرح بانکے مُرلی والے کو تین دِن بعد زندہ کر دیا تھا۔ بانکا خود تو اب بُوڑھا ہو چُکا تھا مگر اُس کی بانسری کا جادُو ویسے ہی جوان تھا۔ اُس کے بارے میں اب بھی یہ بات مشہور تھی کہ اُس کی بانسری کی آواز سُن کر پنچھی اُڑنا بھول جاتے ہیں، اور بہتا پانی رُک جاتا ہے۔

راجا رتن بڑے چاؤ سے بانکے مُرلی والے کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور اُسے نہایت عزّت کے ساتھ اپنے محل میں ٹھہرایا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ اپنے دربار میں ایک شان دار جشن کرے اور بانکا مُرلی والا اُس جشن میں اپنی بانسری کے جوہر دکھائے۔ لیکن میری خالہ کی موت کی وجہ سے اُسے اپنا جشن خالہ کے چالیسویں تک ملتوی کرنا پڑا۔

چنانچہ پَرورپور کے محل میں پہلے میری خالہ کے چالیسویں کی رسمیں ادا ہوئیں اور اِس کے بعد بانکے مُرلی والے نے اپنی بانسری کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ بُوڑھا ہونے کے باوجود اُس میں جوانوں سے کہیں زیادہ دم خم تھا۔ دِن ڈھلا، شام

ہوئی اور پھر رات بھی دھیرے دھیرے گُزرنے لگی، لیکن بانکا ہونٹوں سے مُرلی
لگائے اپنی دُھن میں یوں مست تھا جیسے وہ تھکاوٹ نام کی کسی چیز کو جانتا ہی
نہیں۔ سُننے والے یوں مست ہو کر جھوم رہے تھے جیسے ناگ بین کی لَے پر
مست ہو کر جھومتا ہے۔

بانکے کی بانسری کو سُن سُن کر میں خود بھی حیران ہو رہا تھا۔ بین کی جتنی دُھنیں
مُجھے یاد تھیں، اُس سے کہیں زیادہ وہ بانسری کی دھنیں جانتا تھا۔ ہر دُھن ایک
سے ایک بڑھ کے تھی۔

پھر ٹھیک آدھی رات کے وقت اُس نے بانسری پر ایک ایسی دُھن چھیڑی جس
نے میرے دل و دماغ پر عجیب اثر کیا۔ اِس دُھن کو سُن کر ٹیکسلا کے اُس راج
محل کی یاد آنے لگی، جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ محل کا وہ کمرا میری نگاہوں میں
پِھرنے لگا جو کبھی میری ماں کا کمرا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے باپ کی
شکل میرے ذہن کے پردے پر یوں اُبھری جیسے وہ میرے لیے بے چین ہو اور

مُجھ سے ملنے کی آرزو میں تڑپ رہا ہو۔

یہ ایک بڑی ہی عجیب بات تھی۔ میں نے ٹیکسلا میں جنم ضرور لیا تھا لیکن میں نے اُس شہر کے بارے میں اِس طرح سے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اُس وقت بھی نہیں جب میں اپنی ماں کے مرنے کے بعد پَرور پور کی طرف جاتے ہوئے ٹیکسلا سے گزرا تھا اور میں نے مہاراجا پورس کے ہاتھوں اپنے باپ کی شکست کی خبریوں سُنی تھی جیسے یہ میرے باپ کی نہیں، کسی اور راجا کی شکست ہو۔ اُس وقت بھی نہیں جب سکندر نے ہمیں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا تھا اور راجا امبھی ایک سوالی بن کر میرے اور سارنگ بابا کے پاس آیا تھا۔ اور اس وقت بھی نہیں جب شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت موریہ نے مُجھے، اُوشا اور سارنگ بابا کو راج محل کے اُسی کمرے میں ٹھہرایا تھا جو کبھی میری ماں کا کمرا تھا اور جہاں میں نے جنم لیا تھا اور جہاں راجا امبھی اور میرا سوتیلا بھائی دونوں سوالی بن کر ہمارے سامنے آئے تھے۔ اپنے باپ کے متعلّق میرے خیالات اچھّے نہ تھے۔ وہ جب بھی میرے سامنے آیا تھا، میرے ذہن کے پردے پر اپنی مظلوم ماں کی تصویر اُبھری تھی

اور میرے دِل و دماغ میں آگ سی لگ گئی تھی۔

لیکن اب میرے دِل و دماغ کو کیا ہو گیا تھا؟ میرے دماغ کے پردے پر اپنے باپ کی ایسی تصویر کیوں اُبھر رہی تھی جیسے وہ مُجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہو، جیسے وہ مُجھ سے ملنے کی آرزو میں تڑپ رہا ہو؟

حقیقت میں یہ سب بانکے مُرلی والے کا کمال تھا۔ اُس نے بانسری پر ایک ایسی دُھن چھیڑ رکھی تھی جو پتھّر دِل سے پتھّر دِل بیٹے کا دِل باپ کے حق میں موم کر دیتی تھی جسے سُن کہ ہر جاندار اُس جگہ کی یاد میں بے چین ہونے لگتا تھا جہاں اُس نے آنکھ کھولی ہو۔ یہ بانکے مُرلی والے کی بانسری کا کمال تھا اور بہت بڑا کمال تھا۔ اور یہ طلِسم اُس وقت ٹوٹا جب بانکے مُرلی والے نے بانسری ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پھر تھک کر راجا رتن کو سلام کیا۔

راجا نے قیمتی ہیروں کی کئی مالائیں اُس کی طرف اُچھال دیں اور اُس کے درباریوں نے بھی سونے چاندی کے سِکّے اور دوسری قیمتی چیزیں بانکے مُرلی

والے کے قدموں میں ڈھیر کرنی شروع کر دیں۔

میں بوجھل دِل کے ساتھ محل میں واپس آیا۔ طبیعت پر ایک عجیب طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی، اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ اُس اداسی کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یُوں لگتا تھا کہ بانکے مُرلی والے کی بانسری سُن کر میرے دِل کی جو کیفیّت ہوئی تھی اُس کا اثر ابھی تک قائم تھا۔

اُوشا بھی خاموش خاموش سی لگتی تھی۔ میری طرح وہ بھی شروع سے آخر تک میری ماں کے چالیسویں کی رسموں اور بانکے مُرلی والے کی بانسری کے مظاہرے میں ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک رہی تھی، لیکن اُس نے اس کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی تھی۔ نہ اُس وقت جب بانکا مُرلی والا اپنی بانسری کے جوہر دکھارہا تھا اور نہ اُس کے بعد اپنی اداسی کی طرح اُوشا کی یہ خاموشی بھی مُجھے عجیب لگ رہی تھی۔ میں جب بستر پر لیٹا، تب بھی میرا ذہن اُسی اُدھیڑ بُن میں لگا ہوا تھا۔ اسی حالت میں نہ جانے کب نیند آگئی۔ مگر ذرا سی دیر ہی سویا ہوں گا کہ

ایک دم آنکھ کھل گئی۔ میرے گلے میں جھولنے والا شانی غائب تھا۔ میں چھلانگ لگا کر بستر سے باہر آگیا اور اِدھر اُدھر دیکھا، شانی کا کہیں پتا نہ تھا۔ شانی ہی نہیں، امبر، جو اُوشا کا پالتو سانپ تھا، وہ بھی غائب تھا اور اُس کے ساتھ ساتھ خود اُوشا بھی!

میں نے حیرت سے گھر کا چکّر لگایا اور پھر چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے شانی، امبر اور اُوشا کی تلاش ہی میں نکلوں کہ اُوشا کی ماں آ گئی۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام کر مُسکراتے ہوئے کہا:

''کیا بات ہے بیٹے؟ پریشان کیوں ہو؟''

''شانی غائب ہے! اُوشا اور امبر بھی غائب ہیں!''

اُوشا کی ماں نے اُسی طرح، مُسکراتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
''گھبراؤ نہیں، بیٹے! اُوشا اپنے باپ کے پاس گئی ہے اور شانی اور امبر بھی۔''

”لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔“اُوشا کی ماں فرش پر بیٹھ گئی اور مُجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔
پھر محبّت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔

”انوشا بیٹے! جو کُچھ ہو رہا ہے، قُدرت کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ تُم اُوشا،
شانی اور امبر کے بارے میں کوئی فکر نہ کرو۔ وقت آنے پر وہ خود تمہارے پاس آ
جائیں گے، یا تم اُن کے پاس پہنچ جاؤ گے۔“

یہ کہہ کر اُوشا کی ماں خاصی دیر خاموش رہی اور جب اُس نے زبان کھولی تو اُس کا
لہجہ کُچھ ایسا بدلا بدلا اور پُر اسرار سا تھا کہ میں چونک گیا۔ وہ کہنے لگی:

”انوشا بیٹے! تمہاری ماں نے تمہاری خالہ کی طرح مُجھے بھی اپنے پاس بلایا تھا۔ یہ
چند دِن جو مُجھے ملے ہیں تو صرف اس لیے کہ تمہاری ماں کے حکم کی تعمیل ہو
سکے۔ کل میں بھی تمہاری خالہ کی طرح تمہاری ماں کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ اِس
کے بعد تُم اپنی ماں کے حکم کے مطابق واپس اپنے باپ کے پاس چلے جانا۔“

"باپ کے پاس!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہی بات خالہ نے بھی کہی تھی۔ میرا باپ کہاں ہے اِس دُنیا میں؟ اُسے تو مرے ہوئے پچاس برس سے اُوپر ہو گئے ہیں۔ اگر وہ زندہ بھی ہوتا، تب بھی میں بیٹے کی حیثیت سے اُس کے پاس نہ جاتا۔ اُس نے تو مُجھے اور میری ماں کو راج محل سے نکال دیا تھا۔"

"ہر شخص کی اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے، بیٹے۔ راج محل کی دُنیا تمہاری دُنیا نہیں تھی۔ تمہیں شیش ناگ اور تکشک ناگ کے سائے میں پلنا تھا۔ تمہیں سارنگ بابا کا چیلا بننا تھا اور سارنگ بابا کا چیلا بن کر وہ کُچھ بننا تھا کہ بڑے بڑے راجا تمہارے آگے سر جھکائیں اور بڑے بڑے سورما تمہارے آگے کان پکڑیں اور ماتھا رگڑیں۔ راج محل میں تمہارے لیے کیا رکھا تھا جو تُم وہاں رہتے۔ اور سچّی بات یہ ہے کہ وہاں اب بھی تمہارے لیے کیا رکھا ہے۔"

"کہاں؟"

"ٹیکسلا میں۔" اُوشا کی ماں نے جواب دیا، تمہاری ماں کا مطلب ٹیکسلا سے ہی تھا۔

تمہارے باپ نے تمہیں اور تمہاری ماں کو راج محل سے نکال دیا تھا۔ اِس کے باوجود تمہاری ماں کے لیے ٹیکسلا کا شہر تمہارے باپ کا شہر ہے، بالکل اسی طرح جس طرح پشکلاوتی میرے لیے اُوشا کے باپ کا شہر ہے، حالانکہ اُوشا کے باپ نے اُوشا کو پیدا ہوتے ہی دریائے سندھ کی، لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اُوشا پشکلاوتی گئی ہے؟"

"ہاں بیٹے!" اُوشا کی ماں نے کہا۔ "اور تُم ٹیکسلا جاؤ گے۔"

"اور شانی، امبر وہ کہاں گئے ہیں؟"

"کون جانے وہ بھی اپنے باپ کے پاس گئے ہوں!"

شاید بانکے مُرلی والے کی بانسری کا اثر تھا کہ اُوشا، امبر اور شانی کو اُس جگہ کی یاد ستانے لگی تھی جہاں اُنہوں نے جنم لیا تھا۔۔۔ اور اُن کی طرح مجُھے بھی وہاں جانا تھا جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میری خالہ پہلے ہی میری ماں کا یہ

حکم مُجھے دے کر میری ماں کے پاس چلی گئی تھی۔

میں ان سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ اُوشا کی ماں میرا ماتھا چومتے ہوئے بولی ”بس،

اب جاؤ۔ وہاں تمہارا اِنتظار ہو رہا ہو گا۔“

راج کمار اشوک

اُسی شام اُوشا کی ماں بھی اُسی طرح میری ماں کے پاس چلی گئی جس طرح میری خالہ گئی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے شیش ناگ کے سائے کے بعد تکشک ناگ کے سائے کی مدّت بھی پوری ہو چکی تھی۔ اب شاید پرَورپور سے میرا دانہ پانی اُٹھ گیا تھا اور قُدرت کی طرف سے یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ جس طرح کسی وقت میں پشکلاوتی سے ٹیکسلا کے راستے ہوتا ہوا پرَورپور آیا تھا، اب پرَورپور سے پھر ٹیکسلا کا رُخ کروں۔ شاید ٹیکسلا سے ہوتے ہوئے مُجھے پھر پشکلاوتی جانا پڑے یا کہیں

اور۔ لیکن اب تو مجھے ٹیکسلا پہنچنا تھا کہ یہی میری ماں کا حکم تھا اور اُوشا کی ماں کے کہنے کے مطابق شاید وہاں میرا انتظار ہو رہا تھا۔

اُوشا کی ماں کی آخری رسموں سے فارغ ہوتے ہی میں نے ٹیکسلا کا رُخ کیا۔ ٹیکسلا میں واقعی میرا انتظار ہو رہا تھا۔ وہاں حالات ایک ایسی کروٹ لے چکے تھے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ حالات کی اِس کروٹ کا تعلّق ٹیکسلا ہی سے نہیں، موریہ سلطنت کی راجدھانی پاٹلی پُتر سے بھی تھا۔

سیلوکس کو شکست دینے کے بعد شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت موریہ نے آٹھ سال نہایت شان و شوکت سے حکومت کی تھی۔ اِس سلطنت کی حدیں مشرق میں بنگال کے پانیوں تک اور مغرب میں ہندو کش کے پہاڑی سِلسِلے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دریائے سندھ سے ہندو کش تک کا علاقہ تو اُسے سیلوکس کی بیٹی بیلن سے شادی کے موقع پر جہیز میں ملا تھا، مگر بنگال تک سلطنت کو اُس نے اپنی ہمّت اور دانائی سے پھیلایا تھا۔ جنوب میں اگرچہ اُس کی سلطنت کی حد دریائے نربدا

تھی، مگر وہ دکن کی طرف بڑھتے ہوئے نربدا کے پار کی کئی ریاستوں کو بھی فتح کر چکا تھا۔

چندر گُپت موریہ کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا بُندوسار مگدھ کی راج گدّی پر بیٹھا۔ وہ بہادری، عقل مندی اور حوصلے میں اپنے باپ سے کم نہ تھا، اور وہ چانکیہ جس کے دماغ نے چندر گُپت کو مگدھ کا تخت حاصل کرنے میں مدد دی تھی، بُندوسار کا بھی خاص وزیر تھا۔

بُندوسار نے تخت پر بیٹھتے ہی دکن کا علاقہ فتح کرنے کی طرف توجّہ دی اور نہ صرف میسور تک کا علاقہ فتح کر لیا بلکہ سولہ اور ریاستیں اپنی سلطنت میں شامل کر لیں۔ یہاں تک کہ مشرقی اور مغربی سمندوں کا سارا درمیانی علاقہ اُس کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

بُندوسار کے دبدبے اور ہیبت کا یہ عالم تھا کہ اُس کا لقب ہی امترا گھاٹ یعنی ”دُشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا“ پڑ گیا۔ یونان، مصر، شام اور ایران

کے بادشاہوں نے اُس کے دربار میں اپنے اپنے سفیر مقرّر کر رکھے تھے اور وہ مختلف موقعوں پر تحفوں کا تبادلہ کر کے بُندوسار کے ساتھ اپنی دوستی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

بُندوسار کی ساری توجّہ جنوبی علاقوں کو فتح کرنے پر تھی کہ اُس کی سلطنت کی مغربی سرحدوں پر ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ چندرگُپت موریہ نے مگدھ کی طرف چڑھائی کرنے سے پہلے اپنے محسن راجا پرداتک کے بیٹے کو ٹیکسلا کا حاکم مقرّر کیا تھا اور وہی اُس وقت سے برابر وہاں کا حاکم چلا آ رہا تھا۔ مگر ایک تو وہ بُوڑھا ہو چکا تھا، دوسرے قابلیت کے لحاظ سے کوئی ایسا اچھّا حاکم بھی نہ تھا۔ اُس کے افسروں نے لوگوں کو طرح طرح سے ستانا، تنگ کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اُن افسروں کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے تھے، لیکن وہ دُشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے راجا، راجا بُندوسار کے خوف سے کُچھ نہ کہتے تھے۔ آخر جب معاملہ حد سے زیادہ بڑھنے لگا تو فوج کے ایک دلیر افسر نے کُچھ کرنے کی ٹھانی۔ اُس نے اپنے ہم خیال ساتھیوں کا ایک جتھّا خُفیہ طور پر قائم کیا

اور پھر ایک رات راج محل پر حملہ کر کے ٹیکسلا کے بُوڑھے حاکم کو قتل کرنے کے بعد خود وہاں کا حاکم بن بیٹھا۔ لوگ پہلے حاکم کے ظالم افسروں سے تنگ آئے ہوئے تھے، اُنھوں نے اِس تبدیلی کو کھُلے دِل سے قبول کیا۔ اِس سے اُس کا حوصلہ اور بڑھا۔ اُس نے لوگوں کے دِل جیتنے کے لیے ایسے افسروں کو چُن چُن کر قتل کرا دیا جنھوں نے عوام پر ظلم و ستم کیے تھے۔ پھر اُس نے موریہ حکومت سے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور راجا ابھی سار کا لقب اختیار کر کے ٹیکسلا میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ ابھی سار کا شاید یہ خیال تھا کہ راجا بُندوسار کو دکن کی لڑائیوں ہی سے اتنی فرصت کہاں ملے گی کہ وہ ٹیکسلا کی طرف توجّہ کر سکے۔ لیکن اُس کا خیال غَلَط نکلا۔ بُندوسار کو جیسے ہی ٹیکسلا میں بغاوت کی خبر ملی، اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے اشوک کو ایک بھاری فوج دے کر ٹیکسلا کی طرف روانہ کر دیا۔

اشوک کی عُمر اُس وقت بیس سال سے بھی کم تھی، لیکن اِس کم عُمری ہی میں وہ اپنی قابلیت اور بہادری کا لوہا منوا چکا تھا اپنے باپ کی شاید ہی کوئی جنگی مُہم ایسی ہو جس میں اشوک نے حصّہ نہ لیا ہو۔ بُندوسار کو بھی اپنے اس چھوٹے بیٹے پر ایسا

بھروسا تھا کہ وہ ہر اہم کام اُسی کے سپرد کرتا تھا۔ اِسی لیے اُس نے ٹیکسلا میں بغاوت کی خبر ملتے ہی اشوک کو ٹیکسلا کی طرف روانہ کیا تھا۔

سلیوکس اور چندر گُپت موریہ کی لڑائی کا انجام اُن دونوں کی صلح اور رشتے داری پر ہوا تھا، اور اِس کے نتیجے میں دونوں سلطنتوں میں لوگوں کے آنے جانے کے راستے کھُل گئے تھے۔ اکثر یونانی سپاہی مقامی فوجوں میں بھرتی ہو گئے تھے اور کئی ایک نے دوسری ملازمتیں اختیار کر لی تھیں۔ خود چندر گُپت موریہ نے کئی یونانیوں کو اپنے دربار میں اچھّے اچھّے عہدے دے رکھے تھے۔ اُس نے جنوب کے ایک علاقے پر ایک یونانی کو حاکم مقرّر کر دیا تھا۔ چندر گُپت موریہ کے بعد بُندوسار نے بھی یونانیوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک جاری رکھا۔ اُس کے دربار میں بھی کئی یونانی عہدے دار موجود تھے۔ یہ عہدے دار اُن سفیروں کے علاوہ تھے جو یونان، مصر، شام اور ایران کے بادشاہوں کی طرف سے اُس کے دربار میں مقرّر تھے۔

ٹیکسلا سے پاٹلی پُتر تک کوئی شہر ایسا نہ تھا جس میں یونانی سپاہیوں، تاجروں اور کاریگروں کی اچھّی خاصی تعداد موجود نہ ہو۔ ٹیکسلا چونکہ ایک سرحدی شہر تھا، اِس لیے یہاں یونانیوں کی تعداد دوسرے شہروں سے کہیں زیادہ تھی۔ اِن میں زیادہ تر سپاہی تھے اور یہ اُن فوجیوں کی اولاد تھے جو چندرگُپت موریہ اور سلیوکس کی جنگ کے بعد واپس جانے کے بجائے وہیں ٹھہر گئے تھے۔

ابھی سار نے ٹیکسلا میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو اُس نے ٹیکسلا اور اُس کے آس پاس موجود تمام یونانیوں کو اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ اِس طرح اُسے یقین تھا کہ وہ ٹیکسلا کی خود مختاری کی حفاظت کر سکے گا۔ اسے یہ خبر مل چکی تھی کہ دُشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے راجا بُندوسار نے اپنے چھوٹے بیٹے اشوک کو فوج دے کر ٹیکسلا کی طرف روانہ کر دیا ہے۔ ابھی سار راج کُمار اشوک سے مُقابلے کے لیے اپنی فوج کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ راج کمار اشوک فوج لے کر آندھی کی طرح پاٹلی پُتر سے چلا اور منزلوں پر منزلیں مارتا ٹیکسلا آ پہنچا۔

راجا کُمار مُقابلے کے لیے ابھی پوری تیّاری نہ کر پایا تھا کہ اُسے اشوک کے آنے کی خبر ملی۔ وہ شہر سے باہر نکل کر اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ اشوک کے مُقابلے پر آیا۔ ابھی سار ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا اور اُس کے سپاہیوں میں بھی زیادہ تر گھُڑسوار تھے۔ اشوک کی فوج میں گھُڑسواروں کے علاوہ پیادے، ہاتھی اور رتھ بھی تھے۔ خود راج کُمار اشوک ایک بھاری بھرکم ہاتھی پر ٹیکسلا سے باہر، اُس وسیع میدان میں جو کبھی سکندر اور چندر گُپت موریہ کے جشنوں کی بہار دیکھ چکا تھا۔ راج کُمار اشوک اور راجا ابھی سار کے درمیان مُقابلہ ہوا۔ راجا ابھی سار کے سپاہی بڑی بے جگری سے لڑے لیکن اشوک کی فوج کے سامنے اُن کی وہی حیثیت تھی جو ایک طوفانی دریا کے سامنے چند تِنکوں کی ہوتی ہے۔ خود راجا ابھی سار ادلیری سے لڑ رہا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرانی ہوتی تھی۔ اُس کا سفید گھوڑا اُس کے اور دُشمنوں کے خون سے تر ہو کر سفید سے سُرخ ہو چکا تھا۔

ابھی سار زخموں سے چور ہو کر بھی دُشمن کے سپاہیوں کو گاجر مُولی کی طرح کاٹ رہا تھا، مگر آخر کار وہ زخموں سے بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باعث بے ہوش

ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑتا کہ گھوڑے نے ایک طرف کو جست لگائی اور سنسناتے تیروں اور چمکتے نیزوں کی بوچھاڑ کے درمیان سے اپنے آقا کو نکال کر ایک طرف کو ہوا ہو گیا۔

ابھی سار کے گھوڑے کے بھاگنے کے ساتھ ہی اُس کے سپاہیوں کے بھی قدم اُکھڑ گئے۔ وہ مُشکل سے ڈیڑھ پہر جم کر لڑنے پائے تھے۔ اور اِس ڈیڑھ پہر کی لڑائی میں بھی آدھے سے زیادہ کھیت رہے تھے۔ اپنے راجا کے گھوڑے کو بھاگتے دیکھ کر سپاہی بھی اپنی جانیں بچانے کی فکر میں بھاگ نکلے۔

اشوک کی فوج بھاگنے والے سپاہیوں کا پیچھا کرتی ہوئی ٹیکسلا شہر میں گھُس آئی اور پھر شہر کے گلی کوچوں میں خُون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ لوگوں کا قتلِ عام ہوتا رہا اور ٹیکسلا والوں کا لہو ٹیکسلا کے بازاروں میں پانی کی طرح بہتا رہا۔ چوتھے روز شہر کے بڑے بُوڑھوں کا ایک وفد اشوک کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

"اے راج کُمار! ہم نے تومہاراجا بُندوسار کے خلاف ہیں اور نہ ہمیں تُجھ سے کوئی

دُشمنی ہے۔ ہمیں تو یہاں کے ظالم حاکموں اور افسروں نے تنگ کر رکھا تھا جو جونکوں کی طرح ہمارا خون چوس رہے تھے۔ ہم سے غَلَطی ہوئی جو ہم اِن ظالم حاکموں سے چھٹکارا پانے کی خاطر ابھی سار کی باتوں میں آ گئے اور اُسے اپنا راجا مان بیٹھے۔ ہم اِس غَلَطی کی سخت سزا بھگت چکے ہیں۔ تین دِن سے شہر کی گلیوں میں آدمی کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ کیا ابھی تیرے انتقام کی پیاس نہیں بجھی؟ کیا ابھی تیرا غصّہ ٹھنڈا نہیں ہوا؟ کیا تُو اِس شہر کا نام و نشان مٹا کر ہی دم لے گا؟"

ٹیکسلا کے بڑے بوڑھوں کی منّت سماجت سے اشوک نے قتلِ عام بند کرنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور تلواریں نیام میں ڈال لیں۔ اِسی روز شہر کے سب چھوٹے بڑے تکشک ناگ کے مندر کے سامنے والے میدان میں جمع ہوئے اور اُنھوں نے مہاراجا بُندوسار اور راج کُمار اشوک کی وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ زیادہ تر لوگوں نے مہاتما بُدھ کی قسم کھائی کیونکہ کپل وستو کے راج کُمار ساکیہ منی گوتم بدھ نے جس مذہب کا پرچار راجا بمبی سار کے محل سے

شروع کیا تھا، اب مذہب علاقوں کی طرح ٹیکسلا کے بہت سے لوگ بھی بدھ مت قبول کر چکے تھے۔ ٹیکسلا والوں کی طرف سے وفاداری کے اظہار کے ساتھ ٹیکسلا کی بغاوت ختم ہو گئی۔

بغاوت تو ختم ہو گئی تھی مگر راجا ابھی سار کہاں تھا جو اِس سارے فساد اور بغاوت کی جڑ تھا؟ وہ ابھی سار کہاں تھا جو اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ اشوک کے مُقابلے پر آیا تھا؟ اشوک نے اُسے ایک سفید گھوڑے پر سوار ضرور دیکھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بجلی کی طرح چمکتی ہوئی تلوار بھی دیکھی تھی۔ وہ ایک بار اشوک کے نیزے کی زد میں آیا بھی تھا، اور اشوک نے اپنے ہاتھی کے ہودے سے اُس کی طرف نیزہ بھی پھینکا تھا مگر پتا نہیں وہ کِدھر نکل گیا تھا! اشوک کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُس کا نیزہ ابھی سار کے لگا بھی تھا یا نہیں؟

اب جو بغاوت ختم ہوئی اور شہر والوں نے وفاداری کا حلف اٹھایا تو اشوک نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ باغی ابھی سار کا پتا چلّایا جائے اور اُسے زندہ یا مردہ اُس کے

سامنے پیش کیا جائے۔

اشوک کی بے چینی

راج کُمار اشوک کے اِس حکم کے بعد چاروں طرف ابھی سار کی تلاش ہونے لگی۔ لڑائی میں مارے جانے والے ایک ایک شخص کی لاش کو غور سے دیکھا گیا۔ راج محل کا کونا کونا چھان مارا گیا۔ سپاہیوں نے ٹیکسلا کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے ڈالی۔ ٹیکسلا سے کئی کئی میل دور تک کی آبادیاں کھنگال ڈالی گئیں۔ لیکن ابھی سار کہیں نہ ملا۔ نہ زندہ نہ مُردہ۔ وہ اپنے سفید گھوڑے سمیت ٹیکسلا سے یوں غائب ہو گیا تھا جیسے کبھی وہاں موجود ہی نہ تھا!

راج کمار اشوک حیران تھا کہ ابھی سار کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا! کیا وہ آدمی کے بھیس میں کوئی چھلّاوہ تھا جو یکایک غائب ہو گیا؟

اشوک نے اپنے سپاہیوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ جیسے ہی ابھی سار کے بارے میں کوئی خبر ملے، فوراً اُسے آگاہ کیا جائے، مگر ابھی تک اُسے کوئی خبر نہیں ملی تھی اور جب تک اُسے ابھی سار کے بارے میں کُچھ معلوم نہیں ہو جاتا تھا تب تک اُس کے دِل کو اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔

ہر گزرتے دِن کے ساتھ اشوک کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور جب چالیس دِن اِس حال میں گُزر گئے کہ سپاہی دِن رات ایک کرنے کے باوجود ابھی سار کے بارے میں کوئی پتا نہ چلا سکے، تو اُس کی بے قراری نا قابلِ برداشت ہو گئی اور وہ مجبور ہو کر آدھی رات کے وقت تکشک ناگ مندر کے سامنے والے میدان میں چلا آیا۔ یہ وہی میدان تھا جہاں ٹیکسلا کے لوگوں نے جمع ہو کر مہاراجا بُندوسار اور راج کُمار اشوک کی وفاداری کا حلف اُٹھایا تھا۔ لیکن اِس حلف کے باوجود راج کُمار

اشوک کے دِل کو چین نہ تھا، اِس لیے کہ چالیس دِن گُزر جانے کے باوجود اُس ابھی سار کا کوئی پتا نہ چلا تھا جو ٹیکسلا کے اِس فساد کا بانی اور بغاوت کی جڑ تھا۔

پُونم کا چاند میدان پر اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی بکھیر رہا تھا، مگر اشوک چاندنی کی اِس ٹھنڈک سے بے خبر تکشک ناگ مندر کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اُس کے دِل میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اُس کا باپ بنگال کے پانیوں سے لے کر ہندوکش تک کے پہاڑی سِلسِلوں کا حاکم تھا۔ دُشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والا اُس کا لقب تھا اور یہاں ٹیکسلا میں اُس کا ایک معمولی سا دُشمن چھلّاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا اور ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا تھا!

"تُجھے کیا دُکھ ہے، راج کُمار جو اپنے محل کے نرم نرم بستر سے نکل کر آدھی رات کے وقت یہاں چلا آیا ہے؟"

یہ آواز اشوک کے کانوں میں پڑی تو اُس نے چونک کر دیکھا۔ اُس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک جٹا دھاری جوگی کھڑا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی جٹائیں اور پیٹ کو

چھوتی ہوئی سفید داڑھی دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں اشوک کو گھور رہی تھیں۔ یہ سارنگ بابا تھے۔ اُنہوں نے پھر کہا:

”ہم اپنے گرو ناگیسن جی کے حکم پر شوالک کے پہاڑوں سے آئے ہیں۔ بول اے راج کُمار! تُجھے کیا دُکھ ہے؟ تُجھے کس بات نے بے چین کر رکھا ہے؟“

اشوک نے آگے بڑھ کر سارنگ بابا کے قدم لیے اور پھر ایک ہی سانس میں سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ سارنگ بابا نے پوچھا:

”اب تُو کیا چاہتا ہے؟“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ مُجھے ابھی سار کا پتا چل جائے۔ اگر وہ مر گیا ہے تب بھی اور جیتا ہے تب بھی۔ تاکہ میں اُس کے ساتھ وہی سلوک کروں جو ایک باغی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔“

یہ کہتے کہتے اشوک کا چہرہ غصّے کی آگ سے دہکنے لگا۔ سارنگ بابا نے ایک نظر

اُس کے چہرے پر ڈالی اور پھر مُسکراتے ہوئے بولے۔

"کیا تیرے اطمینان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ٹیکسلا کے لوگوں نے تیری اطاعت قبول کرلی ہے اور مہاراجا بُندوسار کی وفاداری کا حلف اُٹھالیا ہے؟"

"نہیں مہاراج! یہ بات میرے اطمینان کے لیے کافی نہیں۔ اطمینان مُجھے صرف اُس وقت ہو سکتا ہے جب میں اپنے دُشمن کو پکڑ لوں۔ وہ زنجیروں میں بندھا ہوا میرے سامنے پیش ہو تو اُسے مست ہاتھی کے سامنے ڈلوادوں۔ اور پھر۔۔۔۔ اور پھر اُس کا سر کٹوا کر اپنے باپ کے پاس بھیجوں۔ میں بُندوسار کا بیٹا ہوں اور میں نے اپنے باپ سے یہی سیکھا ہے کہ دُشمن پر کبھی اور کسی حال میں بھی رحم نہیں کھانا چاہیے اور اُسے ختم کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔"

سارنگ بابا کے چہرے سے مُسکراہٹ یکایک غائب ہوگئی۔ وہ ایک سخت لہجے میں کہنے لگے۔

”اشوک! تو بُندو سار کا بیٹا ہی نہیں چندر گُپت کا پوتا بھی ہے۔ اُس چندر گُپت کا پوتا جو سُدھانند کے خوف سے چھپتا چھپاتا جان بچاتا آیا تھا اور یہاں اِسی شہر میں سکندر بادشاہ سے ملا تھا تاکہ اُس کی مدد سے اپنا کھویا ہوا راج پاٹ حاصل کر سکے۔ مگر سکندر نے طیش میں آکر اُس کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ قُدرت اُسے زندہ چاہتی تھی اور قُدرت کے ہاتھ نے اُس کی مدد کر کے اُسے سکندر کے سامنے سے اُٹھا کر جہلم کے پار پہنچا دیا۔ لیکن اگر سکندر نے بھی وہی کُچھ کیا ہوتا جو تُو کرنا چاہتا ہے تو آج اِس دُنیا میں نہ تُو ہوتا اور نہ تیرا باپ بُندو سار جس نے تُجھے یہ سبق سکھایا ہے کہ دُشمن پر کسی حال میں بھی رحم نہیں کرنا چاہیے۔ کاش! تو جانتا کہ دُشمن کا سر کُچلنے سے زیادہ بہادری دُشمن کو معاف کرنا ہے۔“

اتنا کہہ کر سارنگ بابا کُچھ دیر کو رُکے اور پھر کہنے لگے۔ رکھنا ”لیکن نہیں راج کُمار! ہم مُجھے کوئی نصیحت نہیں کریں گے۔ اِس وقت مُجھے کوئی نصیحت کرنا بنجر زمین میں بیج ڈالنے والی بات ہے، اور بیج بنجر زمین میں نہیں اُگا کرتے۔ یوں بھی

تو ابھی عُمر کی اُس منزل میں نہیں ہے کہ کسی نصیحت پر کان دھر سکے۔ ہمیں ہمارے گُرو نے تیری امداد کے لیے بھیجا ہے اور ہم تیری امداد کریں گے۔ اِس لیے اطمینان رکھ! ابھی سار جہاں کہیں بھی ہے، ہم اُسے تیرے پاس پہنچانے کا بندوبست کریں گے۔"

"کب؟" اشوک نے بے تابی سے کہا۔

سارنگ بابا ذرا دیر خاموش رہے، پھر کہنے لگے۔

"آج سے پانچ دِن بعد، ٹھیک اِسی وقت اور اِسی جگہ ہمارا بیٹا انوشا یہاں پہنچے گا۔ وہ پل بھر میں پاتال کی خبر لا سکتا ہے۔ آگ، پانی، مٹّی اور ہوا چاروں اُس کا حکم مانتے ہیں۔ وہ جب چاہے وقت کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ وہ یہاں آئے گا اور پھر تیرے دیکھتے ہی دیکھتے ابھی سار کو دُنیا کے چاروں کونوں سے ڈھونڈ کر تیرے قدموں میں لا ڈالے گا۔ پھر جو تیرے جی میں آئے کرنا۔ مگر ہو گا وہی جو قُدرت چاہے گی۔"

باغی ابھی سار

راج کُمار اشوک نے سارنگ بابا کو، بڑی عزّت کے ساتھ راج محل کے مہمان خانے میں ٹھہرایا اور پھر اُس انوشا کا انتظار کرنے لگا جس کے متعلّق سارنگ بابا نے کہا تھا کہ وہ پل بھر میں پاتال کی خبر لا سکتا ہے۔ آگ، پانی، ہوا اور مٹّی چاروں اس کا حکم مانتے ہیں اور وہ جب چاہے وقت کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ اُس کے لیے انتظار کے یہ پانچ دِن پانچ برس بلکہ پانچ سو برس بن گئے تھے۔ پانچواں دِن گُزرنے کے بعد وہ شام ہی سے تکشک ناگ مندر کے بڑے

دروازے کے پاس موجود تھا، اُس انوشا کے اِستقبال کے لیے جس نے سارنگ بابا کے کہنے کے مطابق باغی ابھی سار کو دُنیا کے چاروں کونوں سے ڈھونڈ کر اُس کے قدموں میں لا ڈالنا تھا۔

اور ٹھیک آدھی رات کے وقت میں یوں تکشک ناگ والے میدان میں پہنچا جیسے کوئی پرندہ ہوا میں اُڑتا ہُوا اپنے گھونسلے کی طرف آتا ہے۔ سارنگ بابا کو دیکھتے ہی میں سیدھا اُن کی طرف بڑھا۔ میں نے اُن کی قدم بوسی کی اور اُنھوں نے میرے سر پر محبّت سے ہاتھ پھیرا۔ میں اُن سے اپنی خالہ اور اُوشا کی ماں کے مرنے کی بات کرنا چاہتا تھا۔ انہیں شانی، اُوشا اور امبر کے غائب ہونے کا بتانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی میرا خیال تھا کہ وہ شانی کو میرے گلے سے غائب پا کر ضرور کُچھ پوچھیں گے۔ لیکن اُنھوں نے شانی کے بارے میں کُچھ پوچھنے کے بجائے اشوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”انوشا بیٹے! یہ راج کُمار اشوک ہے، مہاراجا بُندوسار کا بیٹا اور شیش ناگ کے بیٹے

چندر گُپت موریہ کا پوتا۔"

میں آگے بڑھا اور راج کمار کو سلام کر کے اُس کے دونوں ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیے۔ اِس کے ساتھ ہی سارنگ بابا کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔
"انوشا بیٹے! تمہیں یاد ہو گا، ایک بار تُم ہمارے دوست سردار کے بیٹے کو ڈھونڈ کر لائے تھے۔ آج پھر وہی مُہم تمہارے سامنے ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی، ہمارے راج کُمار کا باغی اجی سار کہاں چھُپا بیٹھا ہے؟"

سارنگ بابا نے اِن الفاظ کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو ایک جنگل میں پایا۔ جنگل تو میرے لیے نامانوس تھا لیکن اس کی زمین جانی پہچانی لگتی تھی، اس لیے کہ یہ اس پشکلاوتی کی زمین تھی جہاں میں نے زندگی کے پہلے دس سال شیش ناگ کے سائے میں گزارے تھے۔ جب ہم سکندر کے وقت پشکلاوتی آئے تھے تو ہم نے، میں نے اور اُوشا نے، سارے پشکلاوتی کو ایک بھیانک کھنڈر کی حالت میں دیکھا تھا۔ اُس وقت دُور دُور تک کوئی ایسی بستی نظر نہ آتی تھی جو تباہ نہ ہو چکی ہو۔

شیش ناگ کے مندر کا بیرونی حصّہ بھی تباہ ہو چکا تھا۔ مندر کے اندر شیش ناگ کی مورتی موجود تھی، مگر نہ وہاں کوئی پروہت تھا اور نہ پجاری اور اب اِن سارے کھنڈروں کو بھی ایک خوف ناک جنگل نے ڈھانپ لیا تھا۔ ایسا جنگل جہاں دِن کے وقت بھی رات کی سی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے اِرد گِرد دیکھا اور پھر جھاڑیوں اور درختوں کی جھُکی ہوئی شاخوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، مگر ایک خاص بُو میری رہنمائی کر رہی تھی۔ میں اس بُو سے اچھّی طرح واقف تھا۔ یہ وہی بُو تھی جو مُجھے پَرور پور میں تکشک ناگ مندر کے شمال میں پہاڑی کے دوسری طرف اس پُر اسرار غار تک لے گئی تھی جس کے دروازے پر ایک بھاری بھر کم ناگ پہرا دے رہا تھا اور جس کے اندر سارنگ بابا نے میرے لیے منتر پڑھے تھے۔ یہ وہی بُو تھی جس کی رہنمائی میں مَیں اُس غار تک پہنچا تھا جہاں اُوشا راجا پورس کے دربار سے غائب ہو کر پُر اسرار طور پر پہنچ گئی تھی۔ اُس وقت بھی میں اُسی بُو کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں اِس پُراسرار جنگل میں چلتا رہا۔ آخر درختوں کی گنجائی کم ہوئی اور ایک تھوڑی سی کھُلی جگہ نظر آئی۔ اِس کے ساتھ ہی ایک غار کا دروازہ نظر آیا۔ سفید رنگ کا ایک گھوڑا غار کے دروازے کے قریب ایک درخت سے بندھا تھا، مگر غار کے دروازے پر وہ بھاری بھر کم سانپ موجود نہ تھا جس کی مُجھے توقّع تھی۔ اُس کے بجائے میں نے غار کے دروازے میں اُوشا کو بیٹھے دیکھا جو اپنے پالتو سانپ امبر سے کھیل رہی تھی۔

"اُوشا! تُم! تُم! یہاں کہاں؟" میں حیرت سے چیخ اُٹھا۔ "شیش!" اُوشا نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مُجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی۔ "آہستہ بولو! وہ جاگ جائے گا۔ بڑی مُشکل سے نیند آئی ہے اِسے۔"

"وہ کون؟"

"جس کا یہ گھوڑا ہے۔" اُوشا نے سفید گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "قُدرت نے شاید اِسی کی خاطر مُجھے پَرور پور سے یہاں بھیجا تھا۔ وہ یہاں آیا تو

زخموں سے چُور تھا اور اِس کا سفید گھوڑا اِس کے خُون سے سُرخ ہو رہا تھا۔ میں نے چالیس دِن رات جاگ کر اِس کی دیکھ بھال کی ہے، لیکن اِس کے زخم ابھی اچھّے نہیں ہوئے۔ جسم کی ذرا سی حرکت سے اِس کے بدن میں ٹیسیں اُٹھنے لگتی ہیں۔"

"کیا تُم جانتی ہو وہ کون ہے؟"

"نہیں۔" اُوشا نے جواب دیا۔

"وہ ٹیکسلا کا راجا امبھی سار ہے جس نے ٹیکسلا میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ مہاراجا بُندوسار نے راج کُمار اشوک کو بھاری فوج کے ساتھ ٹیکسلا کی طرف بھیجا تھا۔ ٹیکسلا کے باہر اشوک اور امبھی سار کے درمیان لڑائی ہوئی تھی اور اِس لڑائی میں ابھی سار مع اپنے گھوڑے کے پُر اسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔ ٹیکسلا کے لوگ اشوک کے ساتھ وفاداری کا حلف اُٹھا چُکے ہیں مگر اشوک کو اب بھی ابھی سار کی تلاش ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

”تو تُم اِسے لینے آئے ہو؟“ اُوشا نے بے چینی سے کہا۔ ”تا کہ اِسے اشوک کے حوالے کر دو۔“

”ہاں بالکل اِسی طرح جس طرح میں تمہیں لینے اِس پُر اسرار غار تک پہنچا تھا، تا کہ تمہیں راجا پورس کے حوالے کر دوں۔“

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ اُوشا نے کہا۔ ”اِس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ سفر کر سکے۔ اور پھر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ پورس مہاراج نے تو میری زندگی بخش دی تھی لیکن اشوک اپنے دُشمن کو نہیں بخشے گا۔ وہ اِس کا سر کاٹ کر اپنے باپ کو بھیج دے گا۔ نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

”اُوشا بہن! تمہیں قُدرت کے کاموں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔“

یہ آواز سُن کر میں اور اُوشا دونوں چونک گئے۔ راجا ابھی سار غار کے دروازے میں کھڑا تھا۔ اُس کو ایک نظر دیکھتے ہی مُجھے اندازہ ہو گیا کہ اُس کے زخموں سے

اب بھی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں اور وہ اُنہیں دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر وہ مُجھ سے کہنے لگا:

"آپ مُجھے لینے آئے ہیں انوشا جی؟ میں حاضر ہوں۔ آپ نے میری ماں کے جسم سے سانپ نکال کر اُسے نئی زندگی دی تھی۔ آپ نے مُجھے دُشمنوں سے چھڑا کر دوبارہ میری ماں کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اب آپ مُجھے اشوک کے حوالے کرنا چاہتے ہیں؟ میں اِس کے لیے تیّار ہوں۔ میں خود بھی ایک بہادر کی موت مرنا چاہتا ہوں۔ مُجھے معلوم نہیں کہ جنگ کے میدان سے میرا گھوڑا مُجھے یہاں کس طرح لے آیا۔ اگر اُوشا بہن نے میری مرہم پٹّی اور دیکھ بھال نہ کی ہوتی تو میں کبھی کا مر گیا ہوتا۔"

میں یہ سُن کر حیران رہ گیا۔ یہ ابھی سار اُس سردار کا بیٹا تھا جو سارنگ بابا کا دوست تھا تو پھر سارنگ بابا نے مُجھے اِسے لانے کے لیے کیوں بھیجا ہے؟ کیا اُنہیں معلوم نہیں کہ ابھی سار اُن کے دوست کا بیٹا ہے؟ یقیناً معلوم ہو گا۔ پھر اُنہوں نے ابھی

سار کو اشوک کے پاس لانے کا حکم دینے کے بجائے یہ حکم کیوں نہیں دیا کہ میں ابھی سار کو کسی زیادہ محفوظ جگہ پہنچادوں؟

"آپ کیا سوچنے لگے ہیں؟" ابھی سار کی آواز نے مُجھے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔ "کیا آپ مُجھے اشوک سے باتیں کرنے کا اتنا موقع بھی نہیں دیں گے جتنا موقع آپ نے اشوک کے داداچندرگُپت کو سکندر بادشاہ کے ساتھ باتیں کرنے کا دیا تھا؟"

"نہیں۔" اُوشا چیخ اُٹھی۔ "تُم وہاں نہ جاؤ، بھیّا! وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ ظالم ہے۔ وہ تمہیں ہاتھی کے آگے ڈال دے گا، تمہارا جسم تیروں سے چھلنی کروا دے گا۔ تمہارا سر کاٹ کر اپنے باپ کے پاس بھجوادے گا۔"

ابھی سار نے آگے بڑھ کر اُوشا کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "قُدرت کی پُراسرار طاقتیں مُجھے زخمی اور بے ہوش حالت میں ٹیکسلا سے یہاں لائی تھیں۔ انہی پُراسرار طاقتوں نے تمہارے ہاتھوں مُجھے نئی زندگی دی ہے۔ مُجھے یقین ہے کہ اِس

زندگی کو مُجھ سے چھیننا اشوک کے بس کی بات نہیں۔ تُم چاہو تو خود چل کر یہ تماشا دیکھ سکتی ہو کہ تمہارا بھائی غَلَط نہیں کہہ رہا ہے۔"

"نہیں!" اُوشا نے فیصلہ کُن انداز سے کہا۔ "میں راجاؤں کی دُنیا سے نکل آئی ہوں۔ دوبارہ اُس دُنیا میں جانا نہیں چاہتی۔۔۔ میں یہیں رہوں گی۔۔۔ میں بھی اور امیر بھی۔"

اُوشا کی یہ بات سُن کر میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا فیصلہ اٹل ہے۔ اُس نے اِسی مٹّی سے جنم لیا تھا۔ قُدرت کا پُراسرار ہاتھ اُسے پَرورپور سے یہاں لایا تھا۔ یہاں اُس نے چالیس دِن رات جاگ کر ابھی سار کے زخموں کی مرہم پٹّی اور دیکھ بھال کی تھی۔ اب انوشا اُس ابھی سار کو لینے آیا تھا تاکہ اُسے اشوک کے حوالے کر دے۔ خود ابھی سار بھی اشوک کے پاس جانے کے لیے بے تاب تھا۔ لیکن اُوشا خود وہاں سے کہیں اور جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے تمام سانس اِس مٹّی میں ملا دینا چاہتی

تھی جہاں اُس نے آنکھ کھولی تھی۔

وہ مُڑی اور سفید گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ تمہارا گھوڑا کھڑا ہے۔ جاؤ، اور مُجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

ابھی سار آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ میں نے اُسے سہارا دے کر گھوڑے پر بِٹھایا۔ میں اُوشا سے بہت کُچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مُڑ کر دیکھا تو وہ غار کے اندر چلی گئی تھی۔ ایک بوجھل دِل کے ساتھ میں نے گھوڑے کی باگ تھام لی اور اُس کے آگے آگے پیدل چلنے لگا۔ جھاڑیوں اور درختوں نے ابھی سار کے گھوڑے کو بھی اِسی طرح راستہ دے دیا جس طرح وہ انوشا کو راستہ دے رہے تھے۔ خاصی دیر تک اِسی طرح چلتے رہنے کے بعد ہم جنگل سے باہر آ گئے۔

پھر یکایک میں نے ابھی سار اور اُس کے سفید گھوڑے سمیت اپنے آپ کو ہوا میں اُڑتے محسوس کیا۔ کُچھ دیر بعد ہم ٹیکسلا کے میدان میں پہنچ گئے جہاں راج

کمار اشوک اور سارنگ بابا ہمارے مُنتظر تھے۔

جیسے ہی ابھی سار کے گھوڑے کے سُموں نے زمین کو چھُوا، سارنگ بابا کی آواز میرے کان میں پڑی۔ ”راج کُمار دیکھ! ہمارا انوشا ذرا کی ذرا میں تیرے ابھی سار کو ڈھونڈ لایا ہے۔“

سانگ بابا کے اِن الفاظ کے ساتھ ہی میں یوں چونکا جیسے گہری نیند سے جاگا ہوں۔ میں ابھی تک راج کمار اشوک کے ہاتھ تھامے ہوئے تھا اور چند قدم کے فاصلے پر ابھی سار اپنے سفید گھوڑے پر سوار اشوک کو گھور رہا تھا۔ اشوک حیرت سے کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی سارنگ بابا کی طرف:

”میں اشوک کے ہاتھ چھوڑ کر سارنگ بابا کے پاس آ کھڑا ہوا اور ایک بار پھر ابھی سار کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہ تھی۔ سارنگ بابا اشوک سے کہنے لگے ”راج کُمار! ہم تیرے لیے جو کُچھ کر سکتے تھے، کر دیا۔ ہم نے تیرے دُشمن کو تیرے سامنے لا ڈالا ہے، اب تو جان اور تیرا کام۔ ہمارا کام

اب ختم۔ اب ہمیں کہیں اور جانا ہے۔ کسی اور کی امداد کرنی ہے۔ ایک ماں کی گود کو اُجڑنے سے بچانا ہے، ہم جاتے ہیں اب جو تیرے جی میں آئے کرنا مگر یاد رکھ! ہو گا وہی جو قُدرت کی اَن دیکھی اَن جانی طاقتیں چاہیں گی کہ اِس دُنیا پر اور اِس دُنیا کے انسانوں پر اُسی کا حکم چلتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا نے آگے قدم بڑھایا۔ میں اُن کے ساتھ جانے لگا تھا کہ وہ کہنے لگے۔ "نہیں انوشا بیٹے، تُم ابھی یہیں ٹھہرو۔ شاید راج کمار کو تمہاری ضرورت پڑے۔ یوں بھی تمہارا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر سارنگ بابا ایک طرف کو چل دیے۔ میں اُنہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ راج کمار اشوک کی نگاہیں بھی سارنگ بابا کی طرف لگی ہوئی تھیں اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ہم دونوں کی نظریں ایک ساتھ پلٹ کر ابھی سار پر پڑیں جو اِسی طرح اپنے سفید گھوڑے پر بیٹھا تھا، یُوں جیسے وہ اور اُس کا جاندار نہ ہوں، پتھّر کا بے جان بپت ہوں۔

میرے لیے تو اِس میں حیرانی کی کوئی بات نہ تھی مگر راج کمار اشوک ابھی سار اور اُس کے گھوڑے کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ابھی سار کا گھوڑا زور سے اُچھلا اور ابھی سار ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے آ رہا۔ اشوک کے سپاہیوں نے دوڑ کر گھوڑے کو پکڑ لیا اور ابھی سار کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر اشوک کے قدموں میں ڈال دیا۔

اتنی دیر میں راج کمار اشوک کے حواس درست ہو چکے تھے۔ وہ جان گیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا بلکہ اُس کا باغی ابھی سار واقعی زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا اُس کے قدموں میں پڑا ہے۔ اُسے زنجیروں میں جکڑنے والے سپاہی اُس سے کُچھ دور کھڑے تھے۔ اشوک اُن سپاہیوں سے بولا:

”اِسے لے جاؤ اور قید خانے میں ڈال دو۔ کل ہم اِسے ایسی سزا دیں گے کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو اور پھر کسی کے دماغ میں بغاوت کا خیال بھی نہ آئے۔“

سپاہی ابھی سار کی طرف بڑھنے ہی لگے تھے کہ وہ بول اٹھا۔ ”اشوک تو جو کرنا

چاہتا ہے، آج بلکہ ابھی کر لے۔ کون جانے پھر مُجھے اِس کا موقع ملے بھی کہ نہیں۔“

یہ سُن کر اشوک کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ آگے بڑھا اور ایک پیر سے ابھی سار کے جسم کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہنے لگا۔

”او کم بخت! تجھے یہ کہنے کا حوصلہ کیسے ہوا؟ کیا تُو نہیں جانتا کہ بُندوسار مہاراج کے باغیوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟“

ابھی سار درد سے کراہ اُٹھا لیکن بڑے حوصلے سے کہنے لگا۔ ”راج کُمار! یہ تو مجھے کس کا ڈراوا دے رہا ہے؟ تو اچھّی طرح جانتا ہے کہ مُجھے یہاں کون لایا ہے لیکن یہ نہیں جاتا کہ کیسے اور کہاں سے لایا ہے؟ میں تیری نظروں میں باغی سہی، لیکن مُجھے اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں۔ میں نے ٹیکسلا والوں کو ظالم حاکموں سے نجات دلائی تھی اور تُو ظالموں کا طرف دار بن کر یہاں آیا تھا۔ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تیرے مُقابلے کو نکلا تھا اِس لیے کہ مجھے بُزدلی کی زندگی کے

بجائے بہادری کی موت قبول تھی۔ مگر قُدرت کی اَن دیکھی طاقتوں نے مُجھے جنگ کے میدان سے اُٹھا کر ایک ایسی جگہ پہنچا دیا تھا کہ اگر انوشا جی تیری مدد کو نہ آتے تو تیرے سپاہی ساری عُمر تلاش کرتے رہتے، پھر بھی میرا پتا نہیں چلا سکتے تھے۔"

اشوک نے غُرّا کر کہا۔ "لیکن اب تُو میرے بس میں ہے۔ اور بہت جلد تُجھے معلوم ہو جائے گا کہ شیش ناگ کو چھیڑنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

ابھی سار نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں جواب دیا:

"اشوک تُجھے شاید اِس بات پر مان ہے کہ تُو شیش ناگ کی اولاد ہے۔ لیکن تُو شاید نہیں جانتا کہ ناگ دیوتا کی رگوں میں میری ماں کا خون ہے، مگر میں اِن میں سے کسی بات کو بھی بڑائی نہیں مانتا۔ مہاتما بدھ نے کہا تھا کہ نیکی ہی سب سے بڑی بڑائی ہے۔ جو سچّا اور نیک ہے، وہ چھوٹا ہونے کے باوجود بڑا ہے۔ جو سچّا اور نیک نہیں، وہ بڑا ہونے کے باوجود چھوٹا ہے۔"

"بند کرو یہ بکواس!" اشوک غصّے سے دھاڑا۔ "میں ابھی تُجھے مست ہاتھی کے آگے ڈلوادوں گا۔ میرے تیر انداز تیرا جسم چھلنی کرڈالیں گے۔"

ابھی سارنے اطمینان سے جواب دیا، "تُو چاہے تو میرے لیے اِس سے بھی سخت سزا تجویز کر سکتا ہے، اِس لیے کہ یہاں جیت تیری ہوئی ہے اور ہار میرے حصّے میں آئی ہے۔ لیکن یاد رکھ! میری جان کا مالک تُو نہیں، وہی ہے جو تیری جان اور دوسرے انسانوں کی جان کا مالک ہے۔ وہ چاہے تو مُجھے تیری تمام سزاؤں کے باوجود زندہ رکھ سکتا ہے اور اُس وقت تک زندہ رکھ سکتا ہے جب تک تو تلوار پھینک کر نیکی اور سچّائی کا دامن نہیں تھام لیتا۔"

اشوک کو زنجیروں میں بندھے ہوئے ایک باغی سے ایسے تند و تیز الفاظ سُننے کی توقّع نہیں تھی۔ وہ طیش میں آکر بولا۔

"گستاخ! لے، ابھی تیری زندگی اور موت کا فیصلہ ہوا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پہرے کے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ”شاہی مہاوت سے کہو کہ اِسی وقت مست ہاتھی کو لے کر یہاں پہنچ جائے۔“

یہ حکم سُنتے ہی دو سپاہی محل کی طرف دوڑے اور تھوڑی دیر بعد شاہی مہاوت ایک بھاری بھر کم ہاتھی لے کر میدان میں آ پہنچا۔ ہاتھی کیا تھا، اچھّا خاصا پہاڑ تھا۔ چاند کی چاندنی میں اُس کا سیاہ جسم کُچھ اور بھی ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ مہاوت ہاتھی کو آنکس سے ہانکتا ہوا بیس قدم کے فاصلے پر آ کر رُک گیا اور سر جھُکا کر اشوک سے پوچھا:

”کیا حکم ہے، مہاراج؟“

اشوک نے زنجیروں میں بندھے ہوئے ابھی سار کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ”اپنے ہاتھی کو آگے بڑھاؤ اور اِس گُستاخ باغی کو اِس کے پاؤں تلے روند ڈالو۔“

یہ کہہ کر اشوک ایک طرف ہٹ گیا اور مہاوت نے تیزی سے ہاتھی کو ابھی سار

کی طرف بڑھایا۔ ہاتھی حملہ کرنے کے انداز میں ابھی سار کی طرف آیا لیکن عین اُس کے قریب آکر رُک گیا اور اپنا بھاری بھر کم پاؤں اُٹھا کر بڑے پیار سے سونڈ ہلانے لگا۔

مہارت بار بار ہاتھی کے آنکس چبھوتا تھا، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ ہاتھی کی یہ حرکت اشوک کو بھی بے چین کر رہی تھی۔ اُس نے غصّے سے کہا۔ ”یہ کیا ہو گیا ہے اسے؟“

”میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا مہاراج!“ مہاوت نے بے بسی سے کہا اور طیش میں آکر اوپر تلے کئی آنکس ہاتھی کے جسم میں چبھو دیے۔ لیکن ہاتھی نے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا۔ جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہا۔

”انوشا! مہاتالی! مہاتالی! انوشا!“

میرے کانوں میں جیسے کہیں دُور سے سارنگ بابا کی آواز آئی۔ میں نے جھٹ

بِین سنبھالی اور اُسے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے مہاتالی کی دُھن چھیڑ دی۔ مہاتالی
چھڑتے ہی ہاتھی نے چونک کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا
اور جھر جھری سی لیتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے بین بجاتے ہوئے ہاتھی اور زنجیروں میں بندھے ہوئے ابھی سار کے گرد
تین چکّر لگائے اور ابھی چوتھا چکّر پورا نہ کرنے پایا تھا کہ ہاتھی نے ابھی سار کو
زنجیروں سمیت اُٹھا کر اپنی سُونڈ میں لپیٹ لیا اور دیوانوں کی طرح میدان سے
بھاگ نکلا۔ مہاوت نے اُسے روکنے کی کوشش کی لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے
اب وہ مہاوت کے بس میں نہیں ہے۔

ہاتھی کو بھاگتے دیکھ کر اشوک گھبرا گیا اور سپاہیوں سے بولا۔ "جاؤ اِس کا پیچھا
کرو!" سپاہی ایک دم ہاتھی کے پیچھے بھاگے۔ مہاوت نے پہلے تو آنکس چبھو چبھو
کر ہاتھی کو قابو میں کرنے کی کوشش کی، لیکن جب دیکھا کہ وہ اپنی دھن میں
مست ہے تو اُس نے آنکس ایک طرف پھینک دیا اور ہاتھی کی گردن سے چمٹ

کر بیٹھ گیا۔ اب اُس کی کشش یہ تھی کہ ہاتھی کی گردن سے نیچے نہ گِرنے پائے۔ ہاتھی کس طرف جاتا ہے، اِس سے اُسے کوئی غرض نہ تھی۔ ہاتھی کے بھاگتے ہی میں نے بین ہونٹوں سے ہٹالی تھی اور مندر کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اشوک کا چہرہ گھبراہٹ اور پریشانی کی تصویر بنا ہوا تھا اور وہ میری طرف بار بار یوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو:

"اب کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا، مہاراج؟"

میں نے اُس کی گھبرائی ہوئی نظروں کا پیغام سمجھتے ہوئے کہا۔ "چندر گُپت کے پوتے کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جو کُچھ ہو گا، وہ اُسے جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ اور جو کُچھ ہو گا، اُس کے لیے اچھّا ہی ہو گا۔" اشوک کو میری اِس بات سے اطمینان تو ہو گیا لیکن وہ وہاں سے ہلا نہیں۔

صُبح ہوتے ہوتے آدھے سے زیادہ شہر کو ابھی سار اور ہاتھی کا قصّہ معلوم ہو چکا تھا اور کتنے ہی لوگ گھوڑوں اور رتھوں پر سوار ہو کر مغرب کی طرف چل دیے

تھے۔ کیونکہ ہاتھی نے شہر سے نکل کر مغرب کا ہی رُخ کیا تھا۔

اشوک خُود بھی ہاتھی کے پیچھے پیچھے جانا چاہتا تھا، مگر میدان کی مٹّی نے جیسے اُس کے پیر پکڑ لیے تھے۔ وہ وہیں کھڑا رہا اور اُس سے چند قدم کے فاصلے پر مندر کی دیوار کے ساتھ میں لگا کھڑا تھا۔

سارا دِن اشوک حیران پریشان اُسی میدان میں کھڑا رہا۔ شام ہوئی تو لوگوں نے آ کر اُسے خبر دی۔ "مہاراج! مہاراج! ہاتھی نے ابھی سار کو دریائے سندھ میں پھینک دیا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جیسے ہی ہاتھی نے ابھی سار کو دریا میں پھینکا، ایک بڑے سے مگرمچھ نے اُسے سالم کا سالم ہڑپ کر لیا۔"

یہ خبر سُن کر اشوک نے یوں اطمینان کا سانس لیا جیسے اُس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔ واقعی اُس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ اگلے ہی دِن ایک تیز رفتار گھُڑسوار مہاراجا بُندوسار کے نام ایک خط لے کر پاٹلی پُتر کی طرف جا رہا تھا۔ جس میں اشوک نے اپنے باپ کو اپنے کارنامے کی اِطّلاع اِن الفاظ میں دی

تھی۔

"مہاراج، آپ کی دعاؤں سے میں نے ٹیکسلا کی بغاوت کو پوری طرح کچل دیا ہے۔ اب یہاں ہر طرح سے امن و امان ہے اور لوگ دِل و جان سے آپ کے وفادار ہیں۔ باغی ابھی سار لڑائی کے دوران پُر اسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔ چالیس دِن کی مسلسل تلاش اور بھاگ دوڑ کے بعد گرفتار ہوا اور اُسے بیڑیوں میں جکڑ کر میرے سامنے پیش کیا گیا۔ جب اُس پر مَست ہاتھی چھوڑا گیا تو یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ ہاتھی اُسے اپنے پاؤں تلے روندنے کے بجائے اُسے اپنی سونڈ میں اُٹھا کر بھاگ نکلا اور پھر اُسے لے جا کر دریائے سندھ میں پھینک دیا۔ اُس وقت سینکڑوں لوگ دریا کے کنارے موجود تھے اور ان کا بیان ہے کہ ابھی سار کے دریا میں گِرتے ہی ایک مگرمچھ نے اُسے سالم کا سالم ہڑپ کر لیا۔ مُجھے اِس بات کا افسوس ہے کہ اُس باغی کا سر آپ کی خدمت میں نہیں بھیج سکا۔ شاید قُدرت میری تلوار اُس کے خُون سے ناپاک کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

اور واقعی یہ بات کسی حد تک صحیح تھی کہ قُدرت ابھی سار کا خُون اشوک سے کرانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے اشوک کے اِنتقام کی تسکین کر دی تھی، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ابھی سار کو بھی زندہ سلامت بچا لیا تھا۔ مگر مچھ نے ابھی سار کو اُس مقام پر پہنچ کر اُگل دیا تھا جہاں سارنگ بابا پہلے سے اُس کے مُنتظر تھے۔ یوں انہوں نے اشوک کی امداد کرنے کے بعد اپنے دوست سردار کی بھی امداد کر دی تھی اور اُس کے بیٹے کی زندگی بچا کر ایک ماں کی گود کو اُجڑنے سے بچا لیا تھا۔۔۔۔ ایسا عجیب و غریب واقع ہم نے اِس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

چاند شوک

قُدرت کو تو یہ منظور نہیں تھا کہ ابھی سار کا خُون راج کُمار اشوک کی گردن پر ہو، مگر جنگ کے کھیل اور خُون کی ہولی کے عادی اشوک کے لیے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ ٹیکسلا کی بغاوت کُھلنے سے پہلے وہ اپنے باپ کے ساتھ کتنی ہی جنگوں میں حصّہ لے چکا تھا اور ان جنگوں میں اُس کی تلوار نہ جانے کتنے انسانوں کے خون میں نہا چکی تھی۔

بُندوسار کو اپنے بیٹے کی کامیابی کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوا۔ ٹیکسلا کی مُہم پر روانہ

ہونے سے پہلے اشوک اُجّین کے صوبے کا حاکم تھا۔ اب بُندوسار نے اُجّین کے ساتھ ساتھ اُسے ٹیکسلا کا بھی حاکم بنا دیا۔ اِس طرح اپنی سلطنت کے مغربی علاقوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بُندوسار ایک بھاری لشکر کے ساتھ دکن کی ریاستوں پر طوفان کی طرح ٹوٹ پڑا اور وہاں کے حکمرانوں کو ختم کر کے تمام دکن پر قبضہ کر لیا۔ اِس مہم میں دکن کے سولہ شہر ایسے تھے جو بُندوسار کے ہاتھوں بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔

اشوک بُندوسار کی طرف سے سلطنت کے مغربی علاقوں پر نہایت دبدبے اور رُعب سے حکومت کر رہا تھا۔ بُندوسار نے اگرچہ اُس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اُسے اپنا ولی عہد مقرّر کر دیا تھا مگر اِس کے باوجود اشوک کو اطمینان نہ تھا۔ وہ اچھّی طرح جانتا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اُس کے دوسرے بھائی تخت کے دعوے دار بن سکتے ہیں، اِس لیے وہ اندر ہی اندر اپنی حکومت کو مضبوط بنانے میں لگا ہوا تھا تاکہ باپ کی آنکھیں بند ہونے پر اُس کو پاٹلی پُتر کی راج گدّی پر قبضہ کرنے میں مُشکل پیش نہ آئے۔

مگر قُدرت کو شاید یہ بات منظور نہ تھی۔ جب بُندوسار نے اِس دُنیا سے مُنہ موڑا تو اشوک کے بھائی تخت کے دعوے دار بن کر میدان میں آ گئے اور اشوک اپنے بھائیوں کے ساتھ ایک نے دو، پورے چار سال خونی جنگوں میں اُلجھا رہا۔ اِن جنگوں میں اُس کے بھائی تسّا، سومانا اور شُوسیما خاص طور پر پیش پیش تھے۔ آخر ایک زبردست جنگ کے بعد اشوک اپنے وزیر رادھاگُپت کی مدد سے پاٹلی پُتر کی راج گدی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ بات اُس کی نظر میں کوئی اہمیّت نہیں رکھتی تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کے خون میں نہا کر اِس راج گدّی تک پہنچا ہے۔

راج گدّی پر بیٹھنے کے بعد اشوک نے اپنی تاج پوشی کا جشن نہایت دھوم دھام سے منایا اور پیاداس یعنی "دیوتاؤں کا منظورِ نظر" کا لقب اختیار کیا مگر لوگ اُسے دیوتاؤں کا منظورِ نظر کہنے کے بجائے چاند شوک یعنی "بے رحم اشوک" کہتے تھے۔ اِس لیے کہ اُسے دوسروں کو خاک و خُون میں تڑپا کر خوشی محسوس ہوتی تھی اور اِس کے لیے وہ نئے نئے موقعے اور نئے نئے حیلے ڈھونڈتا رہتا تھا۔

لوگوں نے شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت کا دور دیکھا تھا جو اپنے دُشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے کا لقب پانے کے باوجود اپنی رعایا کا ہمدرد تھا۔ مگر لوگوں نے اشوک ایسا راجا نہیں دیکھا تھا جس کے وجود میں ہر وقت ظلم و ستم کے تند و تیز شُعلے بھڑکتے رہتے تھے، جس کی لپیٹ میں آکر بے شمار مظلوموں کی زندگیاں پَل کی پَل میں ختم ہو جاتی تھیں۔ اُس کی تفریح کی خاطر قیدیوں کو طرح طرح کی دردناک ایذائیں دی جاتی تھیں۔ یہ ایذائیں اور تکلیفیں ایسی خوف ناک تھیں کہ اُنہیں دیکھ کر شام اور یونان کی سلطنتوں کے سفیر بھی کانپ اُٹھتے تھے، حالانکہ اُن کے لیے قیدیوں اور درندوں کے خونی کھیلوں کا تماشا کوئی نئی بات نہ تھی۔

یُوں لگتا تھا جیسے "دیوتاؤں کا منظورِ نظر" کہلانے کے ساتھ ساتھ اشوک رعایا کے ہر چھوٹے بڑے شخص کے دِل پر اپنی ہیبت بٹھا دینا چاہتا تھا۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر انتہائی سخت سزائیں دینے کا عادی تھا۔ کئی بار راج محل کی بہت سی عورتیں، ملازم، اور بچّے بوڑھے اُس کے ظلم کا شکار ہوئے۔ ایک بار اُس نے سینکڑوں عورتوں اور بچّوں کو محض اس بنا پر ہلاک کروا ڈالا کہ اُنہوں نے ایک

مقدّس درخت کی چند ٹہنیاں اور پتّے توڑ لیے تھے۔

بے رحمیوں کا مجسّمہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شکار اور عیش و عشرت کی زندگی کا بھی دلدادہ تھا۔ بھُنے ہوئے مُرغ، تیتر اور بٹیر ہر وقت اُس کے دستر خوان پر چُنے رہتے تھے۔ روزانہ سینکڑوں جانور اور چھوٹے بڑے پرندے اُس کی ضیافت کے لیے ذبح کیے جاتے اور جب وہ شکار کے لیے نکلتا تو بے شمار جانوروں کو صرف تفریح کی خاطر ہلاک کر ڈالا تھا۔

وہ راج گدّی پر بیٹھنے کے بعد بارہ سال تک اپنی رعایا کے ساتھ خاک اور خون کا کھیل کھیلنے کے بعد اُکتا گیا اور اُس کی نظریں اپنی سلطنت کی حدوں کے پار پڑنے لگیں تاکہ اُس کی طبعیت کو جنگ کا خونی کھیل کھیلنے کے لیے کوئی نیا میدان مل سکے۔

جب اشوک راج گدّی پہ بیٹھا تو اُس کی سلطنت مشرق میں بنگال کے پانیوں سے لے کر مغرب میں ہندو کش کے پہاڑی سِلسِلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنوب میں

میسور تک کا علاقہ اُس میں شامل تھا۔ صرف کالنگا ایک ایسی ریاست تھی جو خود مختار تھی۔ یہ ریاست مشرقی ساحل پر دریائے مہاندی اور گوداوری کے درمیان مشرقی گھاٹوں کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھی اور بہت عرصے سے قائم چلی آ رہی تھی۔ اُسے جنوب اور شمال کے علاقوں کی بہترین تجارتی گُزر گاہ خیال کیا جاتا تھا۔ اُس میں بے شمار گھنے جنگلات تھے، جن میں جنگلی ہاتھی پائے جاتے تھے۔ تجارتی گُزر گاہ ہونے کی وجہ سے اور جنگلات اور ہاتھیوں کی کثرت کے باعث کالنگا کا نام دُور دُور تک مشہور تھا۔ دکن کی طرف جانے کے لیے مختصر ترین راستہ کالنگا ہی سے ہو کر جاتا تھا۔

کالنگا ایک مضبوط ریاست تھی اس لیے بُندوسار نے اُس سے چھیڑ چھاڑ کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ مگر اشوک کُچھ اور سوچ رہا تھا۔ اُس کے نزدیک کالنگا کی خود مختاری کو ختم کرنا کئی لحاظ سے ضروری تھا۔ ایک تُو اس لیے کہ دکن تک پہنچنے کے لیے کالنگا کی ریاست راستے میں حائل تھی، دوسرے اس کی خون خوار طبعیت بڑے پیمانے پر خونی کھیل رچانا چاہتی تھی، تیسرے اُس کی تلوار انسانی خون کے

سمندر میں نہانے کے لیے بے تاب تھی، چوتھے یہ کہ وہ اپنے باپ بُندوسار اور
داداچندرگُپت سے بھی بڑھ کر اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑنا چاہتا تھا، اور پانچویں
یہ کہ کالنگا کی راج کُماری مالاویکا اپنی خوب صورتی اور علم و دانائی کی وجہ سے دُور
دُور تک مشہور تھی۔ اپنے محل میں پہلے سے موجود درجنوں رانیوں اور سینکڑوں
باندیوں کے باوجود اشوک اُسے اپنی رانی بنانا چاہتا تھا۔ مگر کالنگا کے راجا نے اُسے
صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی غریب سپاہی کے ہاتھ میں دے
سکتا ہے لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اشوک جیسے ظالم اور بے رحم انسان کا سایہ
بھی مالاویکا پر پڑے۔

اشوک تو پہلے ہی کالنگا پر حملہ کرنے کی تیّاریوں میں لگا ہوا تھا۔ کالنگا کے راجا کا انکار
اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ بن گیا۔ اس نے جنگ کے لیے تیّاریاں کُچھ اور تیز کر دیں
اور اپنے افسروں کو حکم دیا کہ ملک کے کونے کونے سے فوج کے لیے سپاہی بھرتی
کیے جائیں۔ اِس طرح مُلک کا شاید ہی کوئی گھرانا ایسا رہا ہو جس کا کوئی نہ کوئی جوان
اشوک کی فوج میں نہ ہو۔

اشوک نے اس جنگ کے لیے ہتھیاروں اور دوسرے ساز و سامان پر بھی پوری توجّہ دی۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نئی تلواریں، نیزے اور تیر تیّار کرائے، رتھوں کو ٹھیک ٹھاک کیا، گھوڑوں کی کاٹھیاں اور ہاتھیوں کے ہودے بنوائے اور اس طرح فوج کو ہتھیاروں سے پوری طرح لیس کر کے ایک طوفان کی صورت میں کالنگا کی ریاست پر چڑھائی کر دی۔

کالنگا کی جنگ

کالنگا کی ریاست کے خلاف اشوک کی جنگی تیّاریاں بلا وجہ نہیں تھیں۔ یہ ریاست اتنی ہی قدیم تھی جتنی خود شیش ناگ راجاؤں کی ریاست مگدھ۔ جن دِنوں شیش ناگ، خاندان کا پانچواں راجا بمبی سار مگدھ کی چھوٹی سی ریاست کو ایک وسیع اور طاقت ور سلطنت بنانے کے لیے کوشل اور ویسالی کے راجاؤں کی بیٹیوں سے شادیاں کر کے اپنی مغربی اور شمالی سرحدوں کو محفوظ کر رہا تھا۔ اُن دِنوں بھی کالنگا کی ریاست قائم تھی، اور جب بمبی سار کا بیٹا اجاتا شیرو آونتی، کو سمبی،

کوشل اور ویسالی کی ریاستوں کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ تب بھی کالنگا کا وجود قائم تھا۔

کالنگا کے جنوب میں آندھرا کی ریاست تھی اور وقت گُزرنے کے ساتھ اُس ریاست کی حدیں شمال، جنوب اور مغرب کی طرف پھیلتی اور سکڑتی رہتی تھیں، اور اِس طرح کالنگا کی ریاست آندھر اراجاؤں کے حملوں کا اکثر نشانہ بنتی رہتی تھی۔ مگر کالنگا والے غیرت مند اور خود دار تھے۔ آزادی کے لیے مرنا مارنا جانتے تھے اور اِس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیّار رہتے تھے۔ اِس لیے اگر کبھی اُنہیں شکست کھا کر دُشمن کی اطاعت بھی قبول کرنی پڑتی تھی تو وہ موقع پاتے ہی غلامی کے اِس جوئے کو اپنے کاندھوں سے اُتار پھینکتے تھے۔

آخری شیش ناگ راجا مہانند کے قتل کے بعد جب نند راجا مہاپدم نند نے مگدھ کی راج گدّی سنبھالی تھی تو اُس نے کوسمبی، آونتی اور دوسری ریاستوں کے علاوہ کالنگا کی ریاست کو بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ مگر سُدھانند

کے عہد میں کالنگا کے دلیر اور غیرت مند لوگوں نے اپنی آزادی دوبارہ حاصل کر لی تھی۔ بُندوسار نے آندھرا کی وسیع ریاست پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ اور اُس نے اپنی سلطنت کی حدیں جنوب میں میسور تک پھیلا دی تھیں۔ مشرقی اور مغربی سمندروں کا سارا درمیانی علاقہ بُندوسار کی سلطنت میں شامل ہو گیا تھا، مگر دریائے مہاندی اور گوداوری کے درمیان مشرقی گھاٹوں کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ریاست کالنگا اب بھی ایک آزاد اور خود مختار ریاست کی حیثیت سے قائم تھی۔۔۔۔۔ اور اب بُندوسار کے بیٹے اشوک نے ایک بھاری فوج لے کر کالنگا پر حملہ کر دیا تھا۔

کالنگا کا بچّہ بچّہ آزادی کے نام پر مرنا جانتا تھا۔ اُس کا ایک ایک فرد آزادی کی قدر و قیمت سے واقف تھا۔ اُن کے لیے غلامی کی زندگی کے بجائے آزادی کی موت زیادہ قابلِ قبول تھی۔ مگر اُنہیں شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ اِس جنگ کے لیے اشوک نے اپنا سب کُچھ داؤ پر لگا دیا ہے اور وہ ہر قیمت پر یہ جنگ جیتنے کا تہیّہ کیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی ساری فوج کی گردنیں کٹوانے کے لیے تیّار تھا مگر کالنگا کو فتح

کیے بغیر واپس پاٹلی پُتر کارُخ کرنا اُسے کسی صورت بھی منظور نہ تھا۔

کالنگا کے حفاظتی انتظامات کا سِلسِلہ دریائے مہاندی سے گوداوری تک پھیلا ہوا تھا مگر اشوک کی ٹڈّی دَل افواج کے سامنے یہ سارے حفاظتی انتظامات طوفان کے آگے تنکوں کی طرح کمزور ثابت ہوئے۔ اشوک بستیوں کو جلاتا، شہروں کو تباہ و برباد کرتا، انسانوں کا خون پانی کی طرح بہاتا اور راستے کی ہر رکاوٹ کو ٹھوکروں میں اُڑاتا ہوا کالنگا کے دارالحکومت تک جا پہنچا۔

کالنگا کے دارالحکومت کا قلعہ مضبوطی کے لحاظ سے پاٹلی پُتر کے قلعے سے کم نہ تھا مگر جس طرح کالنگا کے دوسرے حفاظتی انتظامات اشوک کی ٹڈّی دَل فوج کا راستہ نہ روک سکے تھے، اِسی طرح اِس قلعے کی مضبوطی بھی کالنگا والوں کے کُچھ کام نہ آسکی۔ اشوک آگ اور خون کا جو کھیل کھیلتا ہوا اِس قلعے تک پہنچا تھا، یہاں وہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ کالنگا کی فوج نے چپّے چپّے پر اشوک کے سپاہیوں کا جم کر مُقابلہ کیا، مگر اُن کے قدم کہیں بھی نہ جم سکے۔ اشوک نے اُس وقت تک دم

نہیں لیا جب تک اُس نے کالنگا کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجا دی اور اُس کے سپاہیوں نے اپنی تلواروں کو اُس وقت نیام میں ڈالا جب اُن کے مقابلے پر آنے کے لیے کوئی نہیں رہا۔

یہ جنگ ایک ایسی خوف ناک جنگ تھی جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ کورکشیتر کے میدان میں جو جنگ کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان اٹھارہ دِن تک ہوتی رہی تھی اور جس میں مُلک کے بڑے بڑے راجاؤں نے بھی حصّہ لیا تھا، اپس جنگ میں بھی اتنا انسانی خون نہیں بہا تھا جتنا اشوک نے کالنگا کی جنگ میں بہایا۔ کالنگا کی عام آبادی پر جو اُس کے ہاتھوں آفت ٹوٹی اُس کا تو ذکر ہی کیا، صرف لڑائی میں جو لوگ مارے گئے، اُن کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ لوگ زخمی اور گرفتار ہوئے۔ اس سے کئی گناہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو جنگ کی تباہیوں کے نتیجے میں موت کی آغوش میں چلے گئے۔

مارے جانے والے لوگوں میں کالنگا کے راجا کے علاوہ اُس کے خاندان کے

دوسرے لوگ بھی شامل تھے، اور جو لوگ گرفتار ہوئے اُن میں ایک کالنگا کی راج کُماری مالاویکا تھی جس کے بارے میں اشوک نے خاص طور پر تاکید کر رکھی تھی اور جس کے گرفتار ہونے کے بعد اُس نے حکم دیا تھا کہ اُسے نہایت عزّت کے ساتھ پاٹلی پُتر پہنچا دیا جائے۔

ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کے خون میں نہانے کے بعد اشوک اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کالنگا کی ریاست مگدھ کی عظیم سلطنت کا حصّہ بن چکی تھی اور اب صحیح معنوں میں دونوں سمندروں کے درمیان کا علاقہ اشوک کی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔

یہ ایک ایسی کامیابی تھی جو اِس سے پہلے نہ چندر گُپت کو نصیب ہوئی تھی اور نہ بُندوسار کو۔ کسی حکمران نے کسی ریاست کو فتح کرنے کی اتنی بھاری قیمت ادا نہیں کی تھی اور نہ کسی حکمران نے کسی ایک جنگ میں دُشمن کا اتنا جانی نقصان کیا تھا۔ چناں چہ کامیابی کے نشے سے سرشار اشوک فتح کے نقّارے بجاتا پاٹلی پُتر کو واپس

ہوا۔ اُس کی فوج کے ساتھ ساتھ اُن قیدیوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں جنہیں کالنگا کی جنگ کے دوران میں گرفتار کیا گیا تھا اور اُن سے کہیں پیچھے کالنگا کی راج کُماری مالاویکا کی سواری تھی جسے ایک خاص حفاظتی دستے کے ساتھ پاٹلی پُتر لے جایا جا رہا تھا۔

راج کُماری مالاویکا

شہر پاٹلی پُتر کے راج محل میں کالنگا کی فتح کا جشن منانے کی تیّاریاں ہو رہی تھیں۔ راج محل کے ہال کو دُلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ مگر شہر کے آدھے سے زیادہ گھروں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ یہ وہ گھر تھے جن کے چراغ کالنگا کی جنگ نے بُجھا دیے تھے۔ یہ اُن ماں باپ کے گھر تھے جن کے کڑیل بیٹوں کو کالنگا کی جنگ کھا گئی تھی۔

اور یہ حالت صرف شہر پاٹلی پُتر ہی کی نہیں تھی، اشوک کی ساری سلطنت میں

کوئی شہر، کوئی بستی، کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جس کے دس بیس یا سو پچاس گھروں سے ماتم کی صدائیں نہ اُٹھ رہی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشوک نے کالنگا کی ریاست فتح کرلی تھی، یہ بات بھی درست ہے کہ اس نے کالنگا کے ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی ہلاک کر ڈالے تھے اور ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ گرفتار کر لیے تھے مگر اُس کی اپنی فوج کا نقصان بھی کُچھ کم نہیں تھا۔ کالنگا والوں نے خُود اپنے خون میں نہانے کے ساتھ اشوک کے بے شمار سپاہیوں کو بھی خون میں ملا دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جن ماؤں کے لال اِس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے تھے، اُن کے لیے اشوک کی فتح کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

خود اشوک بھی اِس فتح سے مطمئن نظر نہیں آتا تھا۔ جب تک راج کُماری مالا ویکا اُس کی رانی بننے پر راضی نہ ہو، تب تک اُس کی نظروں میں کالنگا کی فتح ادھوری تھی۔ اُس نے راج کُماری اور اُس کی پچاس باندیوں اور خادموں کو پاٹلی پُتر کے امروتی باغ والے محل میں ٹھہرایا تھا، خود اپنی نگرانی میں تمام انتظامات مکمّل کرائے تھے اور راج کُماری کے آرام کے لیے ہر قسم کا سامان مہیّا کیا تھا۔ اشوک

ہر صُبح اور شام اُس سے ملاقات کرنے جاتا تھا۔ راج کُماری کی خوب صورتی تو اپنی جگہ پر تھی، لیکن اُس کے علم، اُس کے شائستہ طریقے، اخلاق اور سنجیدگی سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ اُسے نہ تو بناؤ سنگھار کا شوق تھا اور نہ وہ ناچ گانے کو پسند کرتی تھی۔ اُس کی زبان پر کبھی کوئی ایسا لفظ نہیں آیا تھا جس سے یہ اندازہ ہو سکتا کہ وہ کیا سوچتی ہے اور کیا چاہتی ہے۔ کُچھ چاہتی بھی ہے یا نہیں؟

اشوک اور راج کُماری مالاویکا دونوں کو یہ بات اچھّی طرح معلوم تھی کہ اشوک نے کالنگا کے راجا سے مالاویکا کا رشتہ طلب کیا تھا اور راجا نے اُسے صاف صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی غریب سپاہی کے ہاتھ میں دے سکتا ہے لیکن یہ گوارا نہیں کہہ سکتا کہ اشوک جیسے ظالم اور بے رحم انسان کا سایہ بھی مالاویکا پر پڑے۔ مگر اب اشوک انکار کرنے والے اُس راجا کو اُس کی ریاست سمیت خاک اور خون میں تڑپا چکا تھا اور اُس کی بیٹی مالاویکا اشوک کے ایک قیدی مہمان کی حیثیت سے پاٹلی پُتر کے امروتی باغ والے محل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اِس کے باوجود نہ جانے کیوں اشوک اپنے آپ کو اُس کے سامنے بے بس سا

محسوس کرتا تھا۔

مالاویکا نے اپنی گفتگو سے ایک بار بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اشوک کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ اُس نے نہ تو کبھی اپنے باپ کا ذکر کیا تھا اور نہ کبھی کالنگا کی ریاست کا اور نہ اُس ظُلم و سِتم کا جو اشوک نے کالنگا والوں پر توڑا تھا، مگر اشوک اچھّی طرح جانتا اور سمجھتا تھا کہ اُس نے جو کُچھ کیا ہے وہ ایسا نہیں کہ مالاویکا اُسے آسانی سے بھول جاتے۔ وہ مالاویکا کے آرام کے لیے ہر سامان مہیّا کر رہا تھا اور صُبح و شام اُس کی ملاقات کو آتا تھا۔ صرف اِس لیے کہ مالاویکا اپنی خوشی سے اُس کی رانی بننے کو تیّار ہو جائے۔ وہ اِس معاملے میں زبردستی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مالاویکا کے سامنے اُس کے دِل کی بات اُس کے ہونٹوں تک نہیں آتی تھی۔

پھر ایک شام وہ یہ پُختہ ارادہ کر کے مالاویکا کے پاس آیا تھا کہ آج کوئی فیصلہ کر کے ہی جائے گا۔ اشوک یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ راج کُماری مالاویکا سادہ لباس پہنے بیٹھی ہے۔ اُس کے بدن پر نام کو بھی کوئی زیور نہیں تھا۔ اشوک نے اُس سے

باتیں شروع کیں مگر جب کبھی اشوک مالاویکا کے متعلّق کوئی بات کرنے لگتا، وہ فوراً گُفتگو کا رُخ بدل دیتی۔ آخر اشوک نے صاف صاف پوچھ ہی لیا۔

"راج کُماری! تُم اپنے متعلّق کوئی بات ہی نہیں کرتیں، کیا اِس میں کوئی راز ہے؟"

مالاویکا نے جواب دیا۔ "نہیں مہاراج۔ اِس میں کوئی راز نہیں ہے۔ آپ سب کُچھ جانتے ہیں۔ میرا اِس دُنیا میں کوئی نہیں۔"

"جن کا اِس دُنیا میں کوئی نہ ہو، اُن کی دیکھ بھال میرا فرض ہے۔ دُنیا میں بہت سے لوگ اپنا ذکر اِس لیے کرتے ہیں کہ اپنی بڑائی ثابت کریں مگر تمہارا معاملہ ایسا نہیں۔ آخر تمہارے دِل میں کُچھ خواہشیں ہوں گی، کُچھ اُمّیدیں ہوں گی۔ آنے والے دِنوں کے بارے میں تُم نے کُچھ نہ کُچھ سوچا ہو گا۔ کیا تمہیں اِس سِلسِلے میں کسی چیز کی ضرورت ہے؟" اشوک نے پوچھا۔

”مُجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، مہاراج۔“

اشوک مُسکرا دیا۔ ”یہ تو غلَط ہے۔ تُم خود بھی جانتی ہو کہ یہ بات غلَط ہے۔ میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کے علاقوں کا راجا ہوں۔ میں تمہاری خواہشوں کو پورا کر سکتا ہوں۔ تُم حکم کرو۔ میں اُسے پورا کروں گا۔“

مالاویکا نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ ”مہاراج! آپ کی مہربانی کی بدولت مُجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ تو تُم تکلّف کر رہی ہو۔ دِل کی بات صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں؟“

مالاویکا خاموش رہی تو اشوک نے حوصلہ کر کے کہا۔ ”بہت اچھّا۔ تُم اپنے دِل کی بات صاف صاف کہنا نہیں چاہتیں تو تمہاری مرضی۔ لیکن مُجھے اجازت دو کہ میں اپنے دِل کی بات صاف صاف کہہ سکوں۔ میں تمہیں اپنی رانی بنانا چاہتا ہوں۔ بولو! کیا میری رانی بنو گی؟ زبردستی نہیں، اپنی مرضی سے، اپنی خُوشی سے۔“ راج

کُماری مالاویکا اشوک کی یہ بات سُن کر سر سے پاؤں تک کانپ گئی، لیکن خاموش رہی۔ اشوک کہنے لگا:،

”تُم مُجھ سے باتیں کرتی ہو تو میں حیران رہ جاتا ہوں۔ تُم نے محلوں میں آنکھ کھولی ہے۔ تمہاری پرورش ناز و نعمت میں ہوئی ہے۔ تمہارے ہونٹوں سے عقل اور دانائی کے پھول جھڑتے ہیں۔ لیکن تُم ہر وقت کسی فکر میں کھوئی رہتی ہو۔ میں تمہارا غم دور کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے غم کو اپنا غم بنانا چاہتا ہوں۔“

راج کُماری مالاویکا نے سر اُوپر اٹھایا اور کہا۔ ”مہاراج! کل آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔“

اُس شام اشوک مالاویکا سے مل کر واپس آ رہا تھا تو بہت خوش تھا۔ ایک تو اُس لیے کہ اُس نے وہ بات راج کُماری سے کر دی تھی جو بہت دِنوں سے اُس کے ہونٹوں تک نہیں آ رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ اِس بات کو سُن کر راج کُماری نے غصّہ ظاہر نہیں کیا تھا، جب کہ وہ اچھّی طرح جانتی تھی کہ اشوک اُس کے باپ کا قاتل ہے

اور اُس کے ہاتھ کالنگا کے لوگوں کے خُون سے سُرخ ہیں۔ راج کُماری نے اگلے دِن جواب دینے کا وعدہ کیا تھا اور جس انداز سے وعدہ کیا تھا، اُس سے اشوک کو آس تھی کہ راج کُماری کا جواب ہاں میں ہو گا۔

وہ اپنی سوچوں میں گُم آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا کہ ایک جھونپڑی کے پاس سے گُزرتے ہوئے کسی کے رونے کی آواز کانوں میں پڑی۔ وہ رُک گیا اور جھونپڑی کے اَدھ کھُلے دروازے سے اندر نگاہ کی اور پھر آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟ دروازہ کھُلا ہے۔ اندر آ جاؤ!"

اشوک اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک بُڑھیا چیتھڑوں کے ڈھیر پر بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بہت دیر سے رو رہی ہے۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھ کے اشوک کی طرف دیکھا، اور خوف بھری آواز میں بولی:

"اے! کیا تُم چور ہو؟ مگر یہاں تمہارے لیے کیا دھرا ہے!"

اشوک اُس وقت راجا کے لباس میں نہیں تھا۔ اُس نے کہا۔ "نہیں ماں، میں چور نہیں، راجا کا ایک درباری ہوں۔ راجا کے حکم سے ضرورت مند لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتا ہوں۔ میں قریب سے گُزر رہا تھا کہ تمہارے رونے کی آواز سُن کر اِدھر آ گیا۔ تُم اپنی تکلیف بیان کرو۔" بُڑھیا کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ "میری ضرورت کون پوری کر سکتا ہے، بیٹا۔"

اشوک نے جواب دیا۔ "تُم بتاؤ تو سہی۔ میں خود نہ کر سکا تو اشوک مہاراج سے کہہ کر تمہاری ضرورت پوری کرا دوں گا۔"

بُڑھیا کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو اُس کے گالوں پر بہہ نکلے۔ وہ کہنے لگی "تُم اشوک کو جانتے ہو؟"

اشوک کہنے لگا۔ "جاننے کی بھی ایک ہی کہی۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں

اُس کا درباری ہوں۔"

"کیا وہ میری ضرورت پوری کر دے گا؟"

"کیوں نہیں۔ اُس کے خزانے مال و دولت سے بھرے پڑے ہیں۔ وہ ایک لمبی چوڑی سلطنت کا مالک ہے۔ اُس نے کالنگا جیسی طاقت ور ریاست کو فتح کیا ہے۔ وہ کیا نہیں کر سکتا۔"

"کیا وہ رحم دِل ہے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"کہتے ہیں۔۔۔۔۔"

"کون کہتے ہیں؟" بُڑھیا اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "تُم کہتے ہو گے جو اُس کے درباری ہو۔ وہ خوشامدی کہتے ہوں گے جِن کا اُس کے گرد ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا ہے مگر دُنیا اُسے چاند شوک کہتی ہے، بے رحم اشوک۔ وہ اشوک ہے۔ اُسے کوئی غم نہیں لیکن جس کا دِل رحم سے خالی ہو وہ دوسروں کا غم کیا دُور کر سکتا

ہے؟"

اشوک بولا۔ "ایسا نہ کہو ماں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُسے کوئی غم نہ ہو۔ اپنی وسیع سلطنت اور رعایا کا غم ہی اُس کے لیے سب سے بڑا غم ہے۔ میں چاہوں بھی تو۔۔۔۔"

اشوک ایک دم کہتے کہتے رُک گیا۔ بُڑھیا نے چراغ اٹھا کر اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر پوچھا۔ "تُم۔۔۔ تُم کون ہو؟ سچ سچ بتاؤ، تم کون ہو۔"

"میں اشوک ہوں۔" بُڑھیا کے چہرے پر حیرانی ظاہر نہیں ہوئی۔ اُس نے دیا نیچے رکھ دیا، اُس کی بہتی ہوئی آنکھیں خُشک ہو گئیں اور پھر وہ آنکھیں سُرخ انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ اُس کی مُٹھّیاں غصّے سے بھنچ گئیں اوا پھر وہ چیخ اُٹھی:

"تُم اشوک ہو! راجاؤں کے راجا، جس کے خزانے مال و دولت سے بھرے پڑے

ہیں اور جو ایک وسیع سلطنت کا مالک ہے، اور جس نے کالنگا جیسی طاقت ور
ریاست کو فتح کیا ہے۔ اِس فتح سے تُمہاری شہرت دُنیا کے چاروں کونوں تک جا
پہنچی ہے۔ تمہیں تو اِس وقت راج محل میں اپنی رانیوں اور باندیوں کے ساتھ
جشن منانے میں مصروف ہونا چاہیے تھا۔ یہاں ایک غریب بُڑھیا کی جھونپڑی
میں کیا کرنے آئے ہو؟ لیکن نہیں۔ میں جان گئی ہوں۔ تمہارا آنا بلا وجہ نہیں
ہے۔ قاتل اُس جگہ ضرور آیا کرتا ہے جہاں اُس نے کسی کی جان لی ہو۔ تُم میری
کیا ضُرورت پوری کرو گے۔ تُم تو خود چور اور لٹیرے ہو۔ تُم میرے اِس
جھونپڑے سے میری زندگی چھین کر لے گئے ہو۔ مُجھ غریب بیوہ کے دو ہی بچّے
تھے اور میں ہی جانتی ہوں کہ میں نے کیسے کیسے دُکھ اُٹھا کر اُنہیں پالا پوسا تھا۔ وہ
میری اُمّیدوں کا چراغ اور بُڑھاپے کا سہارا تھے۔ مگر تمہارے افسروں نے موت
کے فرشتے بن کر اُنہیں فوج میں بھرتی کر لیا۔ تُم نے کالنگا کی جنگ جیت لی ہے۔
کالنگا کی ریاست پر تمہارا جھنڈا لہرانے لگا ہے، لیکن میرے بچّے کہاں ہیں؟
میدانِ جنگ میں چیلوں اور گِدھوں نے اُن کی لاشیں نوچ لیں، گیدڑوں اور

کُتّوں نے اُن کی ہڈّیاں چبالیں۔۔۔ کیا تُم میری ضرورت پوری کروگے؟ کیا تُم میرے بچّے مُجھے واپس دِلاسکتے ہو۔۔۔۔ تُم راجا نہیں، موت ہو موت!“

بُڑھیا اِتنا کُچھ کہہ کر یوں خاموش ہو گئی جیسے بولتے بولتے نڈِھال ہو گئی ہو۔

اشوک نے خاموشی سے سر جھُکالیا اور جھونپڑی سے نکل آیا۔

سُنہرا ناگ

وہ رات اشوک کے لیے قیامت کی رات تھی۔ مالاویکا کی باتوں سے اُس کے دِل میں اُمّیدوں کے جو چراغ روشن ہوئے تھے، اُن کی جگہ اُن شُعلوں نے لے لی تھی جو پاٹلی پُتر کی ایک بُڑھیا نے اپنی سچّی اور کھری کھری باتوں سے اُس کے سینے میں بھڑکا دیے تھے۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے اُسے اُس کا وہ چہرہ دکھایا تھا جو خوف ناک حد تک بھیانک تھا۔ بُڑھیا کی دو باتوں نے اُس کے دِل میں ایک آگ لگا دی تھی اور اب وہ اپنی زندگی کا جائزہ ایک اور ہی رُخ سے لے رہا تھا۔ جس

طرح اب وہ اپنی ذات کے بارے میں سوچ رہا تھا، اِس سے پہلے اُس نے اِس طرح کبھی نہیں سوچا تھا۔

اُس کے ذہن کے پردے پر ہوش سنبھالنے سے اب تک کے واقعات کی پرچھائیاں اُبھر رہی تھیں۔ اُس کے ذہن کے پردے پر ٹیکسلا کا باغی ابھی سار اُبھر رہا تھا۔ اُس کے ذہن کے پردے پر ٹیکسلا کے وہ بے گناہ شہری اُبھر رہے تھے جن کا خُون تین روز تک شہر کے گلی کوچوں میں پانی کی طرح بہتا رہا تھا۔ اُس کے ذہن کے پردے پر اُس کے بھائی اُبھر رہے تھے، جِن کے خون میں نہا کر وہ پاٹلی پُتر کی راج گدّی تک پہنچا تھا۔ اُس کے ذہن کے پردے پر وہ سینکڑوں عورتیں اور بچّے اُبھر رہے تھے جنہیں اُس نے مقدّس درخت کے پتّے توڑنے کی بناء پر جان سے مار ڈالا تھا۔ اُس کے ذہن کے پردے پر وہ مجبور اور بے بس قیدی اُبھر رہے تھے جنہیں اُس کی تفریح کی خاطر طرح طرح کی دردناک اذیتیں دی گئی تھیں۔

اور پھر اُس کے ذہن کے پردے پر کالنگا کے اُن لاکھوں مظلوم انسانوں کی پرچھائیاں اُبھریں جنہیں اُس نے خاک اور خون میں تڑپا دیا تھا۔ پھر اُس کے کانوں میں وہ درد بھری چیخیں گونجنے لگیں جو اُس کی سلطنت کی ہر بستی، ہر شہر کے دوسرے تیسرے گھر سے اُٹھ رہی تھیں۔ یہ اُن ماؤں کی چیخیں تھیں جن کے کڑیل جوان بیٹوں کو کالنگا کی جنگ نے نگل لیا تھا۔

آگ اور خُون۔۔۔ تباہی اور بربادی۔۔۔۔ چیخیں اور آہیں۔۔۔ دُنیا کو اُس نے یہی کُچھ دیا تھا۔ دُنیا اگر اُسے بے رحم اشوک کہتی تھی تو کُچھ ایسا غَلَط نہیں کہتی تھی۔

پھر اشوک کو یوں لگا جیسے ٹیکسلا سے لے کر کالنگا تک اُس کے ہاتھوں خاک اور خون میں تڑپنے والوں کی پرچھائیاں اُس کے سامنے آ گئی ہیں۔ اُنھوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں۔

تُم موت ہو! تُم قاتل ہو! تُم ہمارے قاتل ہو!

ان پر چھائیوں کی یہ چیخیں ایسی خوف ناک تھیں کہ اشوک نے بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں، مگر وہ خوف ناک اور درد ناک چیخیں پھر بھی اُس کے کانوں میں اُسی طرح گونجتی رہیں۔۔۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ اِن چیخوں کا تعلق باہر کی دُنیا سے تھا ہی کہاں، وہ تو حقیقت میں اشوک کے اپنے اندر کی دُنیا سے تعلّق رکھتی تھی۔ یہ تو اُس کی زندگی کی ساری بُرائیاں اور زیادتیاں تھیں جو ان پر چھائیوں کی صورت میں اُسے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔۔۔۔ یہ تو اُس کا مُردوں کی طرح سویا ہوا ضمیر تھا جو یکایک زندہ ہو کر اُن پر چھائیوں کی صورت میں اُس کے سامنے آگیا تھا اور اُس کے ایک ایک ظُلم، ایک ایک زیادتی کو اُس کی نظروں کے سامنے لا رہا تھا۔ اور یہی وہ ظُلم تھے اور یہی وہ زیادتیاں تھیں جِن کی بنا پر بیگانے ہی نہیں، اپنے بھی اُسے چاند شوک یعنی بے رحم اشوک کہتے تھے۔

وہ واقعی بے رحم تھا۔۔۔ انتہائی بے رحم۔ اب تک اُس کی کوشش یہی رہی تھی کہ اپنے پرائے، چھوٹے بڑے، ہر شخص کے دِل پر اپنا خوف بِٹھا دے اور ہر سر

کو اپنے قدموں میں جھکالے۔ ایسا کرنے میں وہ ضرور کامیاب رہا تھا، لیکن آج پہلی بار اُسے پتا تھا کہ ایسا کر کے اُسے لوگوں کی نفرت کے سوا اور کُچھ حاصل نہیں ہوا۔

بُڑھیا کے سخت بولوں نے اُسے یہ احساس دِلا دیا تھا کہ کِسی شخص کے دِل میں بھی اُس کے لیے نفرت کے سوا اور کُچھ نہیں ہے، یہاں تک کہ اُس کے اِرد گرد جو درباری، امیر وزیر ہر وقت جمگھٹا لگائے رکھتے ہیں اور دِن رات اُس کی تعریف میں زمیں آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، وہ بھی دِل میں اُس سے نفرت ہی کرتے ہیں۔

وہ انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ ایک باندی کی گھبرائی ہوئی آواز اُس کی خواب گاہ میں گونج گئی۔

”مہاراج! مہاراج! راج کُماری مالاویکا کو ناگ نے ڈس لیا ہے۔“

اشوک یہ سُنتے ہی چھلانگ لگا کر بستر سے نکلا اور اُسی لباس میں امروتی باغ والے محل کی طرف دوڑا۔

امروتی باغ میں پھولوں کے ایک کُنج کے درمیان راج کُماری مالا ویکا بے ہوش پڑی تھی اور اُس کے قریب ایک سنہرا ناگ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ راج کُماری کی باندیاں اور خادم گھبراہٹ اور خوف کی تصویر بنے پچاس گز دُور کھڑے تھے۔ اشوک باندیوں اور خادموں کو ایک طرف ہٹاتا ہوا آگے بڑھا ہی تھا کہ ناگ نے پھنکار ماری، آگ کا ایک شُعلہ سا اُس کی طرف بڑھا اور آس پاس کی جھاڑیوں میں آگ لگ گئی۔ وہ ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹ آیا۔ شاید راج کُماری کی باندیاں اور خادم بھی اِس لیے پچاس گز دُور کھڑے تھے کہ وہ پہلے ہی اُس ناگ کی پھنکار کا اثر دیکھ چکے تھے۔

یہ اشوک کے لیے بڑا ہی نازک وقت تھا۔ ایسا نازک وقت اشوک کی ساری زندگی میں کبھی نہیں آیا۔ سب سے پہلا خیال جو اُس کے دل میں آیا، وہ یہ تھا کہ نیزے

یا تیر سے ناگ کو ختم کر دے۔ اُسے اپنے نشانے کے پکّے ہونے پر اعتماد تھا، لیکن ناگ پر یہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اِسی جگہ رہے گا۔ اِس کے علاوہ یہ خطرہ بھی تھا کہ ناگ کے بجائے کہیں خود راج کُماری اُس کے نیزے یا تیر کا نشانہ نہ بن جائے۔

اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ سپیروں اور جوگیوں سے مدد لی جائے۔ اشوک نے اُسی وقت سپاہیوں کو پاٹلی پُتر کے کونے کونے میں دوڑا دیا کہ جو بھی سپیرا اور جوگی ملے، اُسے امروتی باغ لے آئیں۔ پاٹلی پُتر جیسے بڑے شہر میں سپیروں، جوگیوں اور سنیاسیوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ صُبح ہوتے ہوتے پچاس ساٹھ سپیرے اور جوگی امروتی باغ پہنچ چکے تھے۔ اُن میں سے ہر سپیرا اور جوگی اپنے آپ کو بہت پہنچا ہوا سمجھتا تھا۔ مگر جب اُنہوں نے ناگ کی ذرا سی پھُنکار سے باغ کی جھاڑیوں اور درختوں میں آگ لگتے دیکھی تو اُن کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے اور وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔

پھر ایک جوگی نے ہمّت کی اور بین بجاتے ہوئے آہستہ آہستہ ناگ کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے زمین اُس کے پیروں تلے سے کھسکتی جا رہی ہے۔ اصل میں ناگ نے اپنا سانس اندر کی طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا اور ذرا دیر بعد دیکھنے والے یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ جوگی سالم کا سالم اُس ناگ کے پیٹ میں پہنچ گیا ہے!

اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر جوگیوں اور سپیروں کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ اشوک کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے:

”مہاراج! اِس ناگ کو قابو میں کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اِسے تو سارنگ بابا اور انوشا جیسے جوگی ہی پکڑ سکتے ہیں!“

راج کُمار ناگ سین

ہم نے یہ عرصہ کُچھ عجیب طرح گزارا تھا!

جب مہا تالی کے اثر سے اشوک کا ہاتھی باغی ابھی سار کو اپنی سونڈ میں دبا کر دریا کی طرف بھاگا تھا تو میں سارا دِن اشوک کے ساتھ کھڑا رہا تھا۔ شام کے وقت لوگوں نے آ کر اشوک کو یہ اطلاع دی کہ ہاتھی نے باغی ابھی سار کو دریائے سندھ میں پھینک دیا ہے۔ اور ایک مگر مچھ نے اُسے زندہ ہڑپ کر لیا ہے تو میں اشوک سے رُخصت ہو کر دریائے سندھ کے کنارے اُس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں

سارنگ بابا پہلے سے موجود تھے اور جہاں پہنچ کر مگر مچھ نے ابھی سار کو سارنگ بابا کے قدموں میں اُگل دیا تھا۔

ابھی سار کا اشوک کے ہاتھوں سے یوں زندہ بچ نکلنا ایک ایسی حیرت انگیز بات تھی جو شاید خود ابھی سار کو بھی ناقابلِ یقین محسوس ہو رہی تھی۔ مگر قُدرت نے پہلے ہی اُس کے مُنہ سے اُوشا کے سامنے یہ الفاظ کہلوا دیے تھے۔

”قُدرت کی پُر اسرار طاقتیں مُجھے زخمی اور بے ہوش حالت میں ٹیکسلا سے یہاں لائی تھیں۔ ابھی پُر اسرار طاقتوں نے تمہارے ہاتھوں مُجھے نئی زندگی دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اِس زندگی کو مُجھ سے چھیننا اشوک کے بس کی بات نہیں۔“

اِسی لیے وہ اُوشا کے پاس پہنچنے کے لیے بے تاب نظر آتا تھا تاکہ اپنی مُنہ بولی بہن کو یہ بتا سکے کہ اُس کے بھائی نے غَلَط نہیں کہا تھا۔ مگر سارنگ بابا نے اُوشا کو وہیں بُلوا لیا۔ اُسے ابھی سار کو زندہ سلامت ہے کہ جو خوشی ہوئی، وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔

پھر ہمارا یہ قافلہ کشمیر کی اُس بستی کی طرف روانہ ہوا جہاں سارنگ بابا کا دوست سردار رہتا تھا۔ ابھی سار اُسی سردار کا بیٹا تھا اور ہماری اِس ساری مہم کا مقصد ہی یہ تھا کہ ابھی سار کو واپس اُس کے بوڑھے ماں باپ تک پہنچا دیں۔

بُوڑھے سردار کو اپنے بیٹے کی واپسی سے جو خوشی ہوئی، وہ قُدرتی بات تھی۔ وہ تو جشن منانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ جشن اُسے ہی نہیں، اُس کے بُوڑھے ماں باپ کو بھی مُصیبت میں ڈال سکتا تھا۔ اِس لیے سارنگ بابا نے ابھی سار کو سمجھاتے ہوئے کہا!

”ابھی سار! تمھیں اپنے ماں باپ کے لیے تکلیف اور پریشانیوں کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ وہ بُوڑھے ہیں اور اِن کی خدمت کرنا تمھارا فرض ہے۔ مُجھے تمھارے جذبات کا علم ہے لیکن تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تُم اشوک کے لیے مر چُکے ہو۔ قُدرت نے تمھیں اپنے بوڑھے ماں باپ کی خاطر زندگی دی ہے۔ اِن کی خدمت کرو، اور اِن کی دعائیں لو۔“

ابھی سار نے کہا۔ ”مُجھے آپ اور انوشا جی کی بدولت دوبارہ زندگی ملی ہے، میں آپ کے حُکم کے مطابق اِسے اپنے ماں باپ کی خدمت میں بسر کرنے وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن میرا دِل چاہتا ہے کہ میرا اور اشوک کا ایک بار پھر سامنا ہو اور میں اُسے بتا سکوں کہ ابھی سار بُزدل نہیں ہے۔ وہ بہادروں کی موت مرنا جانتا ہے۔“

سارنگ بابا کہنے لگے۔ ”تمہارا اور اشوک کا سامنا ایک بار پھر ہو گا، لیکن اِس طرح نہیں جس طرح تم چاہتے ہو، بلکہ اُس طرح جس طرح قُدرت چاہے گی۔“

تیسرے دِن ہم اُس بستی سے چلے تو اُس میدان کے پاس سے گزرے جہاں کبھی سردار نے اپنی بیوی یعنی ابھی سار کی ماں کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں جشن منایا تھا اور جہاں شانی جیسا سانپ ہمارے ہاتھ آیا تھا۔ اِس کے بعد وہ ایک پل کو بھی مُجھ سے جدا نہ ہوتا تھا۔ مگر اب وہ مُجھے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا! میں نے اداس سے لہجے میں سارنگ بابا سے کہا:

"باباجی! شانی یہیں ہمارے ہاتھ آیا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ یہیں دوبارہ ہم سے آ ملے؟"

سارنگ بابا مُسکرا کر کہنے لگے۔ "قُدرت کا ہر کام اُس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے اور اُس میں انسانوں کی بہتری ہوتی ہے۔ شانی قُدرت کی مرضی سے ہمیں ملا تھا اور جب تک قُدرت کی مرضی تھی ہمارے پاس رہا۔ یُوں بھی اب تمہیں اُس کی کوئی ضرورت نہیں۔ قُدرت شاید تمہیں اِس بہانے یہ بتانا چاہتی تھی کہ یہ دُنیا باکمال لوگوں سے بھری پڑی ہے۔"

"لیکن باباجی!" میں نے کہا۔ "بانکے مُرلی والے کی بانسری کے اثر سے شانی ہی نہیں اُوشا اور امبر بھی غائب ہو گئے تھے۔ جب اُوشا اور امبر واپس آ گئے ہیں تو شانی کو بھی آ جانا چاہیے۔"

"شانی اور امبر کا معاملہ ایک جیسا نہیں ہے۔" سارنگ نے کہا۔ "امبر اُوشا کا جنم جنم کا ساتھی ہے اور شانی اتّفاق سے ہمارے ہاتھ آ گیا تھا۔ مگر وہ تمہارے ساتھ

بالکل ایسے رہا ہے جیسے وہ تمہارا جنم جنم کا ساتھی ہو۔ تمہارا اُس کو یاد کرنا اور اُس کے لیے بے چین ہونا ایک قُدرتی بات ہے۔ لیکن اطمینان رکھو وقت آنے پر تُم دونوں کی ملاقات ہو گی اور ضرور ہو گی۔"

"کہاں ہو گی اور کب ہو گی؟" میں نے بے چینی سے پُوچھا۔

"جب وقت آئے گا تو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔" ہم آگے چل دیے اور پھر ایک ایک کر کے اُن تمام جگہوں سے دوبارہ گُزرے جہاں میں سارنگ بابا کے ساتھ آیا تھا۔ ہم اُس غار کے پاس سے گُزرے جہاں شانی نے غار کے مُنہ پر گِرے ہوئے بھاری پتھّر کو اپنی پھُنکار سے توڑا تھا، اور پھر ویری ناگ کے اُس چشمے پر گئے جہاں سے میں نے سُنہری ناگ کا مَن حاصل کیا تھا اور جسے سارنگ بابا نے دُودھ میں حل کر کے مُجھے پلا دیا تھا۔ اِس چشمے پہ پہنچ کر میرے دِل میں سُنہری ناگ سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی اور پچھلی باتوں کو یاد کرتے ہوئے میں نے چشمے کے کنارے کھڑے ہو کر کہا۔ "اے ویری ناگ کے سُنہری

ناگ! تمہارا بھائی ایک مُدّت کے بعد تمہارے پاس آیا ہے۔ تُم اُس سے نہیں ملو گے؟"

سارنگ بابا ہنس دیے اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "وہ یہاں نہیں ہے، انوشا بیٹے۔ اپنے بھائی سے ملنے گیا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے حیران ہو کر کہا پوچھا۔

"دریائے گنگا کی وادی میں۔" سارنگ بابا نے جواب دیا۔

"کب واپس آئے گا؟"

"شاید کئی سال تک نہ آئے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میری اور اُس کی ملاقات نہ ہو سکے گی؟"

"ہو گی اور ضرور ہو گی۔" سارنگ بابا نے کہا۔

”کب ہو گی، اور کہاں ہو گی؟ یہاں یا کسی اور جگہ؟“

”جب وقت آئے گا تو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔“

پھر ہم راجا ناگ سین کے شہر بھوگ متی پہنچے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں سے مُجھے راجا ناگ سین کے فقیر بھائی کی زبان تحفے میں ملی تھی۔

راجا ناگ سین نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی۔ سارنگ بابا اور میں تو اُس کے لیے اجنبی نہ تھے، ہاں اُوشا کو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک حیرانی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی حیرانی کی وجہ ہمیں بعد میں معلوم ہوئی، اور یہ وجہ بڑی دردناک تھی۔

راجا ناگ سین بُوڑھا ہو چکا تھا، اور اِس بُڑھاپے میں قُدرت نے اُسے ایک ایسا دُکھ دیا تھا جو ہزار دُکھوں کا ایک دُکھ تھا۔ چند دِن پہلے اُس کا اکلوتا لڑکا ایک جھیل میں ڈوب گیا تھا۔ غوطہ خوروں کی سر توڑ کوششوں کے باوجود اُس کی لاش نہیں

ملی تھی۔ ناگ سین اُوشا کی طرف دیر تک حیرانی سے اِس لیے دیکھتا رہا تھا کہ اُس کا اکلوتا لڑکا بالکل اُوشا کا ہم شکل تھا۔

راجا ناگ سین کا ماجرا سُن کر سارنگ بابا میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"انوشا بیٹے! راجا ناگ سین کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ ذرا دیکھو تو ہمارے راجا جی کا بیٹا کہاں ہے؟"

سارنگ بابا کے اِن الفاظ کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو ایک جھیل کے کنارے کھڑا پایا۔ یہ جھیل دو اُونچی اُونچی پہاڑیوں کے درمیان اِس طرح واقع تھی جیسے قُدرت نے اِن پہاڑیوں کے درمیان ٹھنڈے میٹھے صاف شفّاف پانی کا ایک بڑا پیالہ رکھ دیا ہو۔ جھیل کی سطح پر تیرتے ہوئے کنول بڑے ہی بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے کُچھ سوچا اور پھر بین ہونٹوں سے لگالی۔ میں وہی دُھن بجا رہا تھا جو کبھی پشکلاوتی میں شیش ناگ کے مندر میں، ناگ پنچمی کے موقع پر، ناگوں

کو جمع کرنے کے لیے بجایا کرتا تھا۔

ذرا دیر بعد ہی پانی میں شپاشپ کی آواز آنے لگی۔ یُوں لگتا تھا جیسے دریا میں بیسیوں سانپ پھِر رہے ہیں۔ ذرا دیر بعد ہی جھیل کے کنارے سانپوں کا ایک میلا سا لگ گیا اور پھر جیسے اِن سب سانپوں نے ایک آواز ہو کر کہا:

"مہاراج کیا حکم ہے؟"

میں نے بین ہونٹوں سے ہٹالی اور سانپوں سے کہا۔ "راجا ناگ سین کا بیٹا یہاں سیر کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا۔ تلاش کے باوجود اُس کی لاش نہیں ملی۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟" "اس جھیل کی تہہ میں، مگر مچھوں کے غار میں۔" ایک بڑے سے ناگ نے جواب دیا۔

"جاؤ!" میں نے ناگ سے کہا۔ "مگر مچھوں کو جا کر ہمارا پیغام دو کہ وہ اِسی وقت راجا کے بیٹے کو لے آئیں۔"

ناگ اُسی وقت پانی میں غوطہ مار گیا۔ تھوڑی ہی دیر گُزری تھی کہ جھیل کی سطح زور سے ہلنے لگی۔ پھر ایک بڑا سا مگر مچھ جھیل کی سطح پر دِکھائی دیا، کنارے کے پاس آ کر اُس نے اپنے جبڑے کھول کر کوئی چیز اُگل دی اور پھر پانی میں غوطہ مار گیا۔ میں نے دیکھا وہ ہڈّیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔

کُچھ دیر بعد یہ ڈھانچا راجا ناگ سین کے سامنے موجود تھا اور وہ اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ ڈھانچا واقعی اُس کے بیٹے ہی کا ہے؟

پھر جیسے اُسے یقین آ گیا۔ اُس نے ایک آہ بھری اور اُس کی نظر میں ڈھانچے سے ہٹ کر اُوشا کے چہرے پر جم گئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ اُوشا کی طرف دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا۔

"مہاراج! اگر یہ لڑکی کے بجائے لڑکا ہوتی تو میں اِسے آپ سے مانگ لیتا اور اپنا بیٹا بنا لیتا۔" سارنگ بابا بولے۔ "مہاراج! تُم چاہو تو ہم اِسے تمہارا بیٹا بنا سکتے ہیں۔"

”کیا؟“ راجاناگ سین کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔

”ہم اُوشا کو تمہارا بیٹا بنا سکتے ہیں۔“ سارنگ بابا نے کہا۔

”کیوں اُوشا! تُم راجا جی کا بیٹا بننے کو تیّار ہو؟“

اُوشا نے سر جھُکا کر جواب دیا۔ ”جو آپ کا حُکم مہاراج۔ میں تو آپ کی داسی ہوں۔“

”تو لو!“ سارنگ بابا بولے۔ ”جس طرح ہم نے انوشا کو وہ کُچھ بنا دیا ہے جس کے متعلّق اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، اِسی طرح اب ہم تمہیں وہ کُچھ بنانے گئے ہیں جس کا تمہیں کبھی خیال بھی نہیں آیا ہو گا۔“

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے اپنے تھیلے سے چند دوائیں نکال کر ہڈّیوں کے ڈھانچے پر چھڑکیں اور پھر اُوشا سے کہنے لگے۔ ”لاؤ، امبر کو مُجھے دے دو اور تُم اس ڈھانچے کے مُنہ پر اپنا مُنہ رکھ کر لیٹ جاؤ۔“

اُوشا نے امبر سارنگ بابا کو تھما دیا اور خود سارنگ بابا کے مطابق ڈھانچے پر لیٹ گئی۔ سارنگ بابا نے زرد رنگ کی ایک چادر منگوائی اور اُوشا پر ڈال دی۔ پھر اُنہوں نے اُس چادر پر کُچھ دوائیں چھڑکیں اور امبر سے بولے:

"اب تُم اِس چادر پر لیٹ جاؤ۔ دیکھو چُپ چاپ لیٹے رہنا۔ کوئی حرکت نہ کرنا۔"

امبر نے اِس طرح سر ہلایا جیسے سارنگ بابا کی بات سمجھ گیا ہو۔ بابا نے اُسے چھوڑ دیا اور وہ ایک فرماں بردار بچّے کی طرح چادر پر لیٹ گیا۔ اِس کے بعد سارنگ بابا نے سُرخ رنگ کی ایک چادر منگوائی اور اُسے امبر پر ڈال دیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے سفید رنگ کے گلاب کے پھول منگوائے اور سُرخ چادر کو اِن پھولوں سے پوری طرح ڈھانپ دیا۔ یہ کام کر چُکنے کے بعد وہ مُجھ سے مخاطب ہوئے۔

"لو بیٹے! میں اب اِس کے سرہانے بیٹھ کر جاپ کرتا ہوں، تُم پائنتی کی طرف کھڑے ہو کر مہا تالی بجانا شروع کرو، اور پھر قُدرت کا تماشا دیکھو!"

سارنگ بابا سرہانے کی طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور مُنہ ہی مُنہ میں کُچھ پڑھنے لگے۔ میں نے پائنتی کی طرف کھڑے ہو کر مہا تالی کی دُھن بجائی شروع کر دی۔

میں اب تک مہا تالی کے کتنے ہی کرشمے دیکھ چکا تھا مگر اب کے مہا تالی نے سارنگ بابا کے منتروں کے ساتھ مل کر جو کرشمہ دکھایا، وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ مجُھے بین بجاتے تھوڑی ہی دیر گُزری تھی کہ چادر کے نیچے سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھنے لگا۔ اِس کے ساتھ ہی ایک ایسی بُو آنے لگی جیسے کوئی لاش جلائی جا رہی ہو۔ مگر اِس کے باوجود چادروں کے نیچے ذرا سی حرکت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اور پھر دِن ڈھلا، شام ہوئی، رات آ گئی اور پھر صُبح ہو گئی۔ میں بِین بجاتا رہا اور سارنگ بابا منتر پڑھتے رہے۔ صُبح کا سُورج نکلنے کے ساتھ ہی چادروں کے نیچے سے دھواں نکلنا بند ہوا تو سارنگ بابا نے مجُھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بِین ہونٹوں سے ہٹا کر سامنے دیکھا۔ گلاب کے پھولوں کا رنگ سفید سے سُرخ ہو گیا تھا اور اِن پھولوں کے نیچے پڑی ہوئی سُرخ چادر جل کر راکھ ہو چکی

تھی۔ہاں زرد چادر اِسی طرح صحیح سالم دکھائی دے رہی تھی۔ سارنگ بابا نے پانی کی ایک بڑی بالٹی منگوائی اور زرد چادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:

"اِسے اُٹھالو، انوشا بیٹے! لیکن دیکھنا کوئی پھُول یا راکھ وغیرہ نیچے نہ گرنے پائے۔ اِن سب کو اِس بالٹی میں ڈال دو!"

میں نے سارنگ بابا کے حکم کے مطابق زرد چادر کو اُٹھایا اور اُس کی راکھ اور پھولوں کو پانی کی بالٹی میں جھاڑ دیا۔ سارنگ بابا نے امبر کو اُسی زرد چادر پر لٹایا تھا، مگر اب وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ شاید سُرخ چادر کی طرح وہ بھی راکھ میں تبدیل ہو چُکا تھا۔ زرد چادر کو پانی کی بالٹی میں جھاڑ کر میں نے ایک طرف رکھ دیا اور اُوشا کی طرف دیکھا۔اُوشا جیسے گہری نیند سو رہی تھی۔ مگر اس کے نیچے ہڈّیوں کا ڈھانچا موجود نہیں تھا۔

سارنگ بابا نے راکھ اور پھولوں کو پانی میں خوب اچھّی طرح گھولا اور پھر اُس پانی کو اُوشا پر اُنڈیل دیا۔ پانی کا اُنڈیلنا تھا کہ اُوشا جھر جھری لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

لیکن یہ وہ اُوشا نہیں تھی جو سارنگ بابا کے حکم سے ہڈّیوں کے ڈھانچے پر لیٹ گئی تھی، بلکہ اب ہمارے سامنے ایک ایسا نوجوان کھڑا تھا جو اُوشا کا ہم شکل تھا۔

سارنگ بابا نے ہڈّیوں کے ڈھانچے، اُوشا اور اُس کے ساتھ امیر، تینوں کو ایک ہی وجود میں سمو دیا تھا۔ راجاناگ سین ہمارے پاس کھڑا یہ سارا کھیل خاموشی اور حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ سارنگ بابا اُس سے کہنے لگے۔

”لو! ہم نے تمہاری خاطر اپنے جگر کے ٹکڑے کو تمہارا راج کُمار بنا دیا ہے، اور راج کُمار کے رُوپ کے علاوہ اِسے اور بہت کُچھ بھی دے دیا ہے۔“

راجاناگ سین جھٹ آگے بڑھا اور اُس نے سارنگ بابا کے پیر چھو کر کہا۔

”مہاراج! آپ نے راج کُمار کو ہی زندہ نہیں کیا، مُجھے بھی نئی زندگی دے دی ہے۔ میں آپ کا یہ احسان دُنیا میں تو کیا اگلی دُنیا میں بھی نہیں بھولوں گا۔“

سارنگ بابا نے اِس کے جواب میں کُچھ کہنے کے بجائے زرد چادر اُٹھائی اور اپنے

سامنے کھڑے ہوئے اُوشا کے ہم شکل نوجوان کو اُٹھاتے ہوئے بولے۔

"لو! آج سے تُم اُوشا نہیں، راج کُمار ناگ میں ہو۔ راج کُمار کی ہڈّیاں تمہاری ہڈّیاں بن گئی ہیں اور امبر جو اب تک تُم سے الگ تھا، وہ بھی تمہارا حصّہ بن گیا ہے۔ اب تُم پر ایک ایسی دُنیا کے دروازے کھلے ہیں جو کبھی تمہارے خوابوں میں بھی نہیں آئی ہو گی۔ تم اِس دُنیا میں بہت کُچھ بنو گے۔ بہت کُچھ کر کے دِکھاؤ گے۔ یہ زرد چادر اِس مرتبے کی علامت ہے جو آگے چل کہ تمہیں حاصل ہونے والا ہے۔"

سارنگ بابا یہ سب کُچھ کہہ رہے تھے اور میں حیرانی اور بے یقینی سے اُس اُوشا کی طرف دیکھ رہا تھا جو کل شام تک اُوشا تھی اور اب سارنگ بابا نے اُسے اُوشا سے راج کُمار ناگ سین بنا دیا تھا۔

"کِن سوچوں میں کھو گئے ہو انوشا بیٹے؟" اچانک سارنگ بابا کی آواز آئی اور میرے خیالات کا سِلسِلہ ٹوٹ گیا۔ "راج کُمار کو اُس کی نئی زندگی کی مبارک باد

نہیں دو گے ؟"

"مبارک ہو راج کُمار۔" ایک دم میرے مُنہ سے نکلا اور پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں نئ زندگی اور اِس نئ زندگی کی خوشیاں مبارک ہوں۔ ہم جہاں بھی جائیں گے، تمہیں یاد رکھیں گے اور اُمّید ہے کہ تمہیں بھی وہ دِن یاد رہیں گے جو ہم نے ساتھ ساتھ گزارے ہیں۔"

اور یہ کہتے کہتے میری آواز بھرّا گئی۔ میری حالت دیکھ کر سارنگ بابا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "انوشا بیٹے! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ راجا ناگ سین کے بھائی نے تمہیں جو تحفہ دیا تھا، قُدرت نے ہمیں اِس احسان کا تھوڑا سا بدلہ چُکانے کا موقع دیا ہے۔ ہم تو جوگی لوگ ہیں۔ اگر اپنا تن من دھن دے کر بھی دونوں کی سیوا کر سکیں تو یہ بڑے فخر کی بات ہے۔"

راج کُمار ناگ سین نے کہا۔ "انوشا جی! یہ خیال نہ کرنا کہ تُم سے جُدا ہو کر مُجھے کوئی خوشی ہو رہی ہے۔ وہ دِن کہاں بھُلائے جا سکتے ہیں جو ہم نے ایک ساتھ

گزارے ہیں۔ مگر انوشا جی! ہم سب تقدیر کے ہاتھ میں بے بس کھلونوں کی
طرح ہیں اور تقدیر اِن کھلونوں سے جس طرح جی چاہے کھیلتی رہتی ہے۔ چاہے
تو انہیں توڑ پھوڑ ڈالے اور چاہے تو اُن کو کسی نئے کھلونے کی شکل دے ڈالے۔
آج سے ہمارے راستے جُدا ہو رہے ہیں پھر بھی مُجھے یقین ہے کہ ہم کبھی نہ کبھی
ضرور ملیں گے اور ایسے حال میں ملیں گے کہ مُجھے نہ تو تم سے شرمندہ ہونا پڑے
گا اور نہ سارنگ بابا سے۔ ہم ملیں گے اور یوں ملیں گے کہ ہم دونوں کو ایک
دوسرے کو دیکھ کر خوشی ہو گی۔"

میں خاموش رہا لیکن سارنگ بابا بولے۔ "ہمیں یہی اُمّید ہے۔ ہمیں یہی اُمّید
ہے۔" اگلے دِن ہم شہر بھوگ متی سے چلے تو میرا دِل جیسے منوں بوجھ تلے دبا ہوا
تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک بار پھر اُسی لُٹے پٹے اور بے سہارا انوشا کی طرح محسوس
کر رہا تھا جو اپنی ماں کے مرنے کے بعد پشکلاوتی سے پَرور پور کی طرف روانہ ہوا
تھا اور میری یہ کیفیّت صرف اِس وجہ سے تھی کہ سارنگ بابا اُوشا کو راج کُمار
ناگ سین کا روپ دے کر بھوگ متی کے راجا کے محل میں چھوڑ آئے تھے۔

سارنگ بابا میری اداسی کی وجہ اچھّی طرح سمجھ رہے تھے۔ وہ خود بھی کُچھ خاموش خاموش سے تھے۔ بھوگ متی کے شہر میں آنے سے پہلے اُنھوں نے یہ اِرادہ ظاہر کیا تھا کہ راجاناگ سین سے رُخصت ہونے کے بعد مان سرور کے راجا اور اُس کی بیٹی کانتا سے ملیں گے، جسے ہماری بدولت ناگیسن مہاراج کی بد دُعا سے نجات ملی تھی مگر میری اُداسی کو دیکھ کر اُنھوں نے اپنا اِرادہ بدل دیا اور ہم بھوگ متی سے سیدھے شیل شر نگن کی پہاڑی پر پہنچ گئے۔

اِس سے پہلے جب ہم پاٹلی پُتر سے چل کر، نیپال کی ترائی سے ہوتے ہوئے، شیل شر نگن آئے تھے تو ناگیسن مہاراج نے ہمیں جہلم کے کنارے پہنچنے کا حکم دیا تھا کیونکہ اُس وقت شیش ناگ کا بیٹا چندر گُپت موریا سلیوکس کے مُقابلے کے لیے اپنی فوج لے کر دریائے جہلم کے کنارے پہنچا ہوا تھا اور ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ مگر اب بظاہر ایسی کوئی صورت نہیں تھی اِس لیے ناگیسن مہاراج نے ہمیں اپنے غار میں اپنا مہمان بنا کر ٹھہرایا۔

اب میرا جی یہی چاہتا تھا کہ ساری عُمر ناگیسن مہاراج کے قدموں میں گزار دوں۔ سارنگ بابا کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو پہلے ہی ایک عُمر اُن کے قدموں میں گزار چکے تھے۔

مگر یُوں لگتا تھا جیسے میری یہ خواہش پوری نہیں ہو گی۔ میرے پاؤں میں تو ایک چکّر تھا۔ پہلے مُجھے کب کسی ایک جگہ ٹِک کر بیٹھنا نصیب ہوا تھا جو ناگیسن مہاراج کے قدموں میں زندگی گزار دینے کی آرزو پوری ہو سکتی۔ پہلے ہی دِن اُنہوں نے مُجھ سے کہا تھا:

"انوشا بیٹے! تم نے دُنیا میں وہ کُچھ دیکھا ہے جو کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن ابھی تمھیں اور بہت کُچھ دیکھنا ہے۔ تُم نے اپنی عُمر کا ایک حصّہ شیش اور تکشک کے سائے میں گزرا ہے۔ تُم نے شیش اور تکشک کی عظمت کے دِن دیکھے ہیں لیکن اب تُم دُنیا میں جاؤ گے تو دیکھو گے کہ وہاں ایک نئی روشنی پھیل رہی ہے۔ لوگ شیش اور تکشک کو ہی نہیں، دوسرے دیوتاؤں کو بھی بھولتے جا رہے ہیں۔ وہ

مندروں میں رکھی ہوئی دیوتاؤں کی اُن مورتیوں کو توڑ رہے ہیں جِن کے آگے اُن کے بڑے اپنے سر جھُکاتے رہے ہیں۔۔۔ ذاتوں کی اُونچ پنچ مٹتی جا رہی ہے۔۔۔ برہمن اور شُودر ایک ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ تُم دیکھو گے۔۔۔ یہ سب کُچھ دیکھو گے اور اس کے علاوہ اور بہت کُچھ دیکھو گے!"

ہمیں ناگیسن جی کے پاس ٹھہرے آدھا دِن اور ایک رات ہوئی تھی کہ صُبح ہی صُبح اُنھوں نے مُجھے اور سارنگ بابا کو حکم دیا۔

"جاؤ اور ابھی جاؤ! پاٹلی پُتر کے امروتی والے باغ میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے!"

مالاویکا کا فیصلہ

"آ گئے!" "سارنگ بابا آ گئے! انوشا جی آ گئے!"

امروتی باغ کے بڑے دروازے پر کتنی ہی آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔ باغ سے بھاگتے ہوئے پیروں اور جوگیوں کے قدم رہیں رُک گئے اور وہ ہمیں ایک جلوس کی صورت میں لے کر وہاں آ گئے جہاں راجاؤں کا راجا اشوک کھڑا تھا اور ایک عظیم سلطنت کا مالک ہونے کے باوجود نہایت بے بسی سے پھولوں کے اُس کُنج کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں راج کُماری مالاویکا بے ہوش پڑی تھی اور اُس کے قریب

وہ سُنہری ناگ پھن پھیلائے بیٹھا تھا جس نے سپیروں کے ایک ساتھی کو سمُوچا نِگل لیا تھا۔

”مہاراج! سارنگ بابا آ گئے ہیں۔ انوشا جی آ گئے ہیں!“ سپیروں کی اِن آوازوں سے اشوک چونک اٹھا۔ اُس نے ہماری طرف دیکھا اور ہم نے اس کی طرف۔ میری نظروں میں اُس اشوک کا سراپا گھُوم گیا جسے ہم نے ٹیکسلا میں دیکھا تھا۔ وہ اشوک راج کُمار تھا اور یہ اشوک راجاؤں کا راجا مگر اُس وقت وہ اِتنا بے بس نہیں تھا جتنا اِس وقت دِکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر سارنگ بابا کے ہاتھ تھام لیے اور بولا:

”مہاراج! آپ نے بہت پہلے ٹیکسلا میں میری امداد کی تھی۔ آج میں پھر ایک سوالی کے روپ میں آپ کے سامنے ہوں۔ میری مدد کیجیئے۔ راج کُماری کو اِس ناگ کے پنجے سے نکالیے۔ راج کُماری کو کُچھ ہو گیا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔“

سارنگ بابا مُسکرا دیے اور بولے۔ ”چندر گُپت کے پوتے! اطمینان رکھ! ٹیکسلا

میں بھی ہم اپنے گرو کے حکم پر تیری مدد کے لیے آئے تھے اور یہاں بھی ہمیں ہمارے گرو نے بھیجا ہے۔ اطمینان رکھ! ابھی سب کُچھ ٹھیک ہوا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر سارنگ بابا مُجھ سے مخاطب ہوئے۔ "انوشا بیٹے! جاؤ دیکھو۔ تمہارا ویری ناگ والا بھائی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

سارنگ بابا کا حکم پا کر میں اُس پھولوں کے کُنج کی طرف بڑھا جہاں راج کُماری مالا ویکا بے ہوش پڑی تھی۔ جب میری نظر اُس سُنہرے ناگ پر پڑی جو اُس کے قریب پھن پھیلائے بیٹھا تھا تو میں حیران رہ گیا یہ تو وہی ویری ناگ کے چشمے والا سُنہری ناگ تھا۔ اُسے پہچانتے ہی میں ایک دم پکارا:

"ارے! میں تو تُم سے ملنے ویری ناگ کے چشمے پر گیا تھا، اور تم یہاں ہو؟"

سُنہری ناگ نے بھی مُجھے پہچان لیا۔ ہلکی سی شُوں کے ساتھ وہ رینگتا ہوا میرے پاس آیا اور پھر مُجھ سے بچھڑے ہوئے دوست کی طرح لپٹ گیا۔

”تُم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“

”میں تمہارا انتظار کر رہا تھا، انوشا بھائی!“

”میرا انتظار؟ میں کُچھ نہیں سمجھا؟ پوری بات بتاؤ۔“

”انوشا بھائی میرا بھائی ایک مدّت سے بیمار تھا اور میں اُس کی خبر لینے کے لیے آیا تھا۔ وہ گیا کے شہر میں بڑ کے اُس درخت کی جڑوں میں رہتا ہے جس کے نیچے بیٹھ کر گوتم بُدھ نے گیان حاصل کیا تھا۔ وہ اب ایک مقدّس درخت سمجھا جاتا ہے اور اس کے نیچے دِن رات بھکشوؤں کا مجمع لگا رہتا ہے جو گوتم بُدھ کی تعریف میں گیت گاتے رہتے ہیں۔ وہ گیروے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں اور جان داروں کو تکلیف دینا پاپ سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھکشو میرے اور میرے بھائی کے حال پر بہت مہربان تھا۔ اُسی کی مہربانی سے میرے بھائی نے بیماری سے نجات پائی اور اُسی کے حکم سے میں اِس مقدّس درخت کے پتّے راج کُماری کے لیے لے کر آیا تھا۔ اُس نے مجھے یہ تاکید بھی کی تھی کہ راج کُماری کے پاس اُس وقت تک

رہنا جب تک تمہارا دُودھ شریک بھائی نہ آ جائے۔ سو، مُجھے تمہارا انتظار تھا انشا بھائی۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تُم اتنی جلدی آ جاؤ گے۔"

سُنہری ناگ کی یہ بات سُن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر ایک نظر مالا ویکا پر ڈالی جو ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے کہا۔ "کیا تُم نے شہزادی کو ڈسا بھی ہے؟"

"نہیں، میرے بھائی۔" سُنہری ناگ نے جواب دیا۔ "میں نے تو مقدّس درخت کے پتّے اِس کے سامنے ڈال دیے تھے، اُس نے اِن پتّوں کو اُٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔ تب سے وہ اِسی حالت میں ہے۔"

"ہم میں یہ گُفتگُو ہو ہی رہی تھی کہ راج کماری مالا ویکا نے ایک جھر جھری لی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھول کر اُس نے اپنے اِرد گرد دیکھا اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر سارنگ بابا اشوک کو لے کر راج کُماری کی طرف آئے اور اُس سے کہا۔ "لو! سب کُچھ ٹھیک ہو گیا۔"

اشوک آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے کبھی راج کُماری کی طرف دیکھتا اور کبھی میرے ساتھ لپٹے ہوئے سُنہری ناگ کی طرف۔ کُچھ یہی کیفیّت دور کھڑے ہوئے سپیروں اور جوگیوں کی تھی۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جس ناگ نے اپنی پھُنکار سے جھاڑیوں میں آگ لگا دی تھی اور جس نے اُن کے ایک ساتھی کو سمُوچا نگل لیا تھا، اُسے انوشا نے قابو میں کر لیا ہے اور وہ بھی بین بجائے اور کوئی منتر پڑھے بغیر!

اشوک کی ہچکچاہٹ دیکھ کر سارنگ بابا نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ اب وہ کسی کو کُچھ نہیں کہے گا۔ وہ اپنا کام پُورا کر چُکا ہے۔" سارنگ بابا کے اِن الفاظ سے حوصلہ پا کر اشوک آگے بڑھا اور راج کُماری مالا ویکا سے کہنے لگا۔ "مالا ویکا! تُم ــــــ تُم خیریت سے ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" مالا ویکا نے ادب سے جواب دیا آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

اشوک نے یہ سُن کر سارنگ بابا کے ہاتھ تھام لیے اور بولا "مہاراج! آپ اور انوشاجی نے آج مُجھے بہت بڑی شرمندگی سے بچالیاہے۔"

اشوک کی دیکھا دیکھی سپیروں اور جوگیوں نے بھی سارنگ بابا کے ہاتھ چومنے شروع کردیے۔ وہ تو شاید میرے ساتھ بھی ایسی ہی عقیدت کا اظہار کرتے لیکن میرے ساتھ لپٹے ہوئے سُنہری ناگ کو دیکھ کر اُنہیں میرے پاس آنے کی ہمّت نہیں پڑتی تھی۔

اشوک نے سپیروں اور جوگیوں کو اُن کے حال پر چھوڑا اور پھر مالاویکا کو ساتھ لے کر محل کی طرف بڑھا۔ محل کے دروازے پر اُس نے کہا، "مالاویکا تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

مالاویکانے جواب دیا۔ "آپ کو آج شام تک اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔" راج کُماری یہ کہہ کر محل کے اندر داخل ہو گئی اور اشوک سارنگ بابا سے مخاطب ہوا۔ "آیئے مہاراج! آپ مالاویکا کے نہیں، میرے مہمان ہیں۔"

اور یُوں ہم ایک بار پھر پاٹلی پُتر کے اُس راج محل میں مہمان بن کر داخل ہوئے جہاں ہم نے نند خاندان کے راجا سُدھانند سے یو گا نند تک کے قتل کا خونیں تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

مگر اِس بار ایسا کوئی تماشا دیکھنا ہماری قسمت میں نہیں تھا۔ اِس کے بجائے تقدیر ایک اور ہی تماشا رچانے کی تیّاری کر رہی تھی۔ راج کُماری مالا ویکا نے شام تک اشوک کے سوال کا جواب دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اشوک انتظار کی تاب نہ لاتے ہوئے شام سے پہلے ہی امروتی باغ والے محل میں پہنچ گیا تھا تاکہ جلد سے جلد راج کُماری کی اپنی زبان سے اُس کا فیصلہ سُن سکے۔

شام کا وقت تھا اور اشوک امروتی باغ میں راج کُماری مالا ویکا کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ اُس شام راج کُماری مالا ویکا نے اپنا بہترین لباس پہنا تھا اور اُس کی زرق برق پوشاک پر سونے چاندی کے زیورات ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

خاصی دیر تک وہ دونوں امروتی باغ کی سبز اور نرم نرم گھاس پر خاموشی سے ٹہلتے رہے اور دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ آخر اشوک نے ہمّت کر کے خود ہی بات کا آغاز کیا۔

"مالاویکا! میں بہت دیر سے تمہارا فیصلہ سُننے کا مُنتظر ہوں۔ بولو! کیا تُم میری رانی بنو گی؟"

مالاویکا نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "مہاراج! اگر اِس دُنیا میں میرے لیے کوئی جگہ ہوتی تو آج شام میں اپنے آپ کو دُنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب عورت سمجھتی مگر افسوس کہ اِس دُنیا کی کوئی خوشی میرے لیے نہیں ہے!"

"یہ کیسی بات کر رہی ہو؟" اشوک نے حیران ہو کر کہا۔ "کون کہتا ہے کہ اِس دُنیا میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟ کون کہتا ہے کہ اِس دُنیا کی کوئی خوشی تمہارے لیے نہیں ہے؟ میری ہر خوشی، تمہاری خُوشی ہے۔"

مالاویکا چند لمحے خاموش رہی، پھر کہنے لگی۔ ”آپ کی رانی بننا میرے لیے فخر کی بات ہوتی، مگر اب دُنیا اور اُس کی دلچسپیوں میں میرے لیے کوئی کشش نہیں رہی۔ یہ زندگی، یہ دُنیا اور اُس کی دِلچسپیاں سب عارضی اور فانی ہیں۔ دولت اور جوانی کب تک قائم رہ سکتے ہیں؟ میرا باپ اتنی بڑی ریاست کا مالک تھا۔ آج وہ ریاست کہاں ہے؟ میری زندگی کی مُہار میرے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کوئی پُر اسرار ہاتھ مجُھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔“

”مالاویکا۔“ اشوک چیخ اُٹھا۔ ”تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔“

”مہاراج! ہر انسان کی اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ صُبح والا ماجرا کیا تھا؟ وہ سُنہری ناگ میرے لیے شہر ”گیا“ سے اُس مقدّس درخت کے دو پتّے لے کر آیا تھا جس کے نیچے بیٹھ کر مہاتما بُدھ نے گیان حاصل کیا تھا۔ اِن پتّوں کی خُوشبو نے مجُھ پر ایک ایسی کیفیّت طاری کر دی تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجُھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بُدھ کے چرنوں میں بیٹھی

ہوئی ہوں۔ میری روح ایک ایسا اطمینان محسوس کر رہی تھی جو اِس سے پہلے میں نے بڑی سے بڑی خوشی کے موقع پر بھی محسوس نہیں کیا تھا۔۔۔ اور یہ کیفیّت اُس وقت تک قائم رہی جب تک انوشا جی نے آکر اُس سُنہری ناگ کو قابو میں نہیں کر لیا۔ میں اِس بارے میں پہلے بھی سوچتی رہی ہوں، مگر صُبح کے واقعے نے میری ساری ہچکچاہٹ دور کر دی ہے، اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی زندگی مہاتما بُدھ کی جوگن بن کر گزار دوں گی۔ اب میری زندگی میں نہ کسی راجا کے محل کی جگہ ہے اور نہ اُس کے تخت کی۔ راج محل اور راج گدّی دونوں میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے۔ اب میں نہ کسی راجا کی بیٹی ہوں اور نہ کسی راجا کی رانی۔۔۔ میں تو اب صرف اور صرف بُدھ کی جوگن ہوں۔۔۔ میری منزل 'گیا' ہے، سارناتھ ہے، کپل وستو ہے۔"

یہ کہتے کہتے مالاویکا نے اپنی نگاہیں اُوپر اُٹھائیں۔ اُس کے چہرے پر اطمینان کی ایک روشنی تھی جیسے اُس نے اپنی منزل کو پا لیا ہو۔ اُس نے ایک ایک کر کے اپنے تمام زیورات اُتار کر سبز گھاس پر پھینک دیے۔ پھر اپنے زرق برق کپڑے

اُتار پھینکے۔ اب اشوک کے سامنے وہ مالاویکا کھڑی تھی جِس نے گیروے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ لباس جو بُدھ کے بھکشوؤں کا لباس تھا۔ اب اشوک کے سامنے وہ مالاویکا کھڑی تھی جو راج کماری نہیں، بُدھ کی جوگن تھی۔

مالاویکا نے اپنے گیروے رنگ کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہی میرا فیصلہ ہے۔"

اور پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک گیت آ گیا، جسے اشوک نے سُنا اور حیران رہ گیا۔ مالاویکا بُدھ کی تعریف میں گیت گا رہی تھی، اور پھر وہ گیت گاتے ہوئے باہر چلی گئی۔ اشوک یُوں اپنی جگہ کھڑا رہا جیسے دھرتی نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔

انقلاب

کالنگا کی جنگ میں جس بے دردی سے انسانی خون بہا تھا اور جو تباہی اور بربادی ہوئی تھی، اشوک کو اُس کا احساس پہلے ہی ہو چکا تھا۔ جب راج کُماری مالا ویکا بھی گوتم بُدھ کی جوگن بن کر اور دُنیا سے مُنہ موڑ کر بھکشن بن گئی تو اشوک کی زندگی میں یکایک انقلاب آ گیا۔ اُسے احساس ہو گیا کہ اپنی سلطنت کی حدوں کو بڑھانا، دنیاوی شان و شوکت کی چند روزہ زندگی کے لیے تلوار اُٹھانا اور انسانی جانوں سے کھیلنا بہت بڑا ظُلم ہے۔

کالنگا کی فتح کی خوشی میں جو جشن منایا گیا اُس میں اشوک نے اعلان کیا کہ اب اُس کی تلوار ہمیشہ کے لیے نیام میں رہے گی اور وہ بُدھ کے ایک سچّے پیرو کی طرح زندگی بسر کرے گا اور اپنی طاقت بُدھ کے پیغام کو پھیلانے میں صرف کر دے گا۔ اُس نے سے بھی عہد کیا کہ آئندہ مُلک فتح کرنے کے بجائے لوگوں کے دِل جیتنا اُس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہو گا۔

کالنگا کی جنگ سے بہت پہلے ہی لوگ گوتم بُدھ کے نام سے واقف ہو چکے تھے۔ گیروے رنگ کے کپڑے پہنے بھکشو مُلک کے کونے کونے میں اِس پیغام کو پھیلا رہے تھے۔ ہندو مت کی پیچیدہ رسموں اور ذات پات کی پابندیوں سے تنگ آئے ہوئے لوگ بڑی تیزی سے بُدھ مت قبول کرتے جا رہے تھے کیونکہ بُدھ مت میں ذات پات کی کوئی قید نہیں تھی اور گوتم بُدھ کی تعلیم اخلاق کے سیدھے سادھے اصولوں پر مبنی تھی اور یہ اصول بھی اُس زبان میں بیان کیے جاتے تھے جسے عام لوگ آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔

مگر اشوک نے گوتم بُدھ کے پیغام کو پھیلانے کے لیے جس پیمانے پر کام کرنا شروع کیا، وہ اُسی کا حصّہ تھا۔ پہلے اُسے سیر اور شکار کا بہت شوق تھا اور اُس نے باورچی خانے میں روزانہ ہزاروں جانور ذبح کیے جاتے تھے۔ مگر اب اُس نے جانوروں کو ذبح یا شکار کرنے کے بجائے اُن کی حفاظت کو اپنا فرض ٹھہرایا اور ہر قسم کے جانوروں کو مارنے کی ممانعت کر دی۔

پھر اُس نے مقدّس مقامات کی زیارت کے لیے سفر کیا۔ اِس سفر میں اُس کے ساتھ اٹھارہ ہزار لوگ تھے۔ اُس نے جِن مقامات کی زیارت کی، اُن میں لمبینی باغ جہاں گوتم بُدھ کی پیدائش ہوئی، کپل وستو جہاں گوتم بُدھ نے اپنی جوانی گزاری، گیا جہاں ایک بڑ کے درخت کے نیچے گوتم بُدھ کو گیان حاصل ہوا، سار ناتھ جہاں ہرنوں کے میدان میں گوتم بُدھ نے اپنا پہلا وعظ کہا، کشیا نگر جہاں گوتم بُدھ اس دُنیا سے رُخصت ہوئے، اور کئی دوسرے مقامات شامل تھے۔ اِن تمام مقامات پر اشوک نے کتبے اور لاٹھیں لگوائیں جن پر بُدھ مت کے اصول لکھے گئے تھے۔

اشوک نے اپنی سلطنت کے مختلف شہروں میں بڑے بڑے راستوں کے سنگم پر لاٹھیں نصب کرائی تھیں۔ اُن پر بُدھ مت کے عام اخلاقی اصول مثلاً اہنسا (کسی کی جان نہ لینا) کے قانون کی پابندی کرنا، بزرگوں اور عالموں کی عزّت کرنا، خیرات کرنا، چھوٹوں سے مہربانی کا برتاؤ کرنا، نیکی اور راست بازی کی زندگی بسر کرنا وغیرہ ہر علاقے کی عام بولی میں لکھے گئے تھے۔ اِن لاٹھوں کا سِلسِلہ اشوک کی پوری سلطنت میں پھیلا ہوا تھا۔

یہ لاٹھیں پتھّر کی تھیں۔ ہر لاٹھ کے تین حصّے ہوتے تھے۔ زمین کے اندر کا حصّہ، درمیانی حصّہ اور اُوپر کا حصّہ۔ تینوں حصّے اندر سے تانبے کے تاروں کے ذریعے جڑے ہوئے تھے۔ درمیانی حصّہ ثابت پتھّر کا ہوتا تھا، جس پر بُدھ مت کے اصول یا کوئی دوسری عبارت لکھی جاتی تھی۔ اُوپر کے حصّے پر شیر، ہاتھی یا بیل کا بُت ہوتا تھا یا اُلٹا کنول، پھول یا گھنٹی وغیرہ۔ سارناتھ کی لاٹھ کے اوپر کے حصّے پر چار شیروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، جو بالکل اصلی شیر معلوم ہوتے تھے۔

مُلک کے جِن حصّوں میں چٹانیں موجود تھیں، وہاں اشوک نے اِن چٹانوں پر مختلف اصول اور احکام کھُدوائے تھے۔ کالنگا کی ریاست میں ایک کتبے پر اشوک نے کالنگا کی جنگ کے تمام واقعات کھُدوائے اور پھر دوسرے کتبے میں یہ عبارت لکھوائی:

”رعایا کے تمام لوگ میرے بچّے ہیں۔ جس طرح میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ میرے اپنے بچّے اِس دُنیا اور اگلی دُنیا میں آرام و سکون سے رہیں، اِسی طرح میں اپنی رعایا کے لیے بھی ویسی ہی خواہشات رکھتا ہوں۔“

اشوک اپنی رعایا کو اپنے بچّوں کی طرح سمجھتا تھا۔ اِس لیے ہر کوئی اُس سے جب چاہتا اور جہاں چاہتا بغیر کسی روک ٹوک کے مل سکتا تھا۔ اُس نے اپنے افسروں کو بھی یہی حکم دے رکھا تھا کہ لوگوں کے ساتھ نرمی اور ہمدردی کا سلوک کریں۔

اشوک انسان اور حیوان دونوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے انسانوں کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی شفاخانے قائم کیے، مسافروں اور جانوروں کے آرام

کے لیے سڑکوں کے دونوں طرف آم اور کیلے کے درخت لگوائے اور ہر آٹھ کوس کے فاصلے پر کنویں کھدوائے جن میں اُترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ غریبوں کی مدد کے لیے اُس نے لنگر جاری کیے۔

اشوک کالنگا کی جنگ سے پہلے جتنا سخت دِل اور ظالم تھا، اب اُتنا ہی نرم دِل اور مہربان بن گیا تھا۔ پہلے اُس کی تفریح کی خاطر قیدیوں کو طرح طرح کی ایذائیں دی جاتی تھیں، مگر اب وہ مُجرموں کے ساتھ بھی نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔ اشوک نے بُدھ مت کا پرچار صرف اپنے ہی مُلک میں نہیں کیا اُس نے گوتم بُدھ کے پیغام کو پھیلانے لیے لنکا، مصر، شام، افریقہ، جاپان، تبّت، چین، برما، سیام اور مقدونیہ تک بُدھ عالم روانہ کیے۔ لنکا میں اشوک کو خاص طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ وہاں اشوک نے اپنے بیٹے مہندرا اور بیٹی سنگھاترا کو بھیجا تھا۔ اُس وقت لنکا پر راجا تیسا کی حکومت تھی۔ اُس نے اُن سے بہت اچھّا سلوک کیا اور بُدھ مت کے بھکشوؤں کے لیے انورادھاپُور کے مقام پر ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔ اشوک کی اِنہی کوششوں کی وجہ سے بُدھ مت کے ماننے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی

تھی۔ اشوک اگرچہ بُدھ مت کا زبردست حامی تھا لیکن اُس نے مذہبی رواداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُس نے دوسرے مذہبوں کے لوگوں کو بھی وظیفے اور جاگیریں دیں اور کبھی کسی کو زبردستی بُدھ مت قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ اس کی ذاتی خوبیوں کی کشش تھی جس سے لوگ بُدھ مت کی طرف کھینچے چلے آئے۔

بُدھ مت اختیار کر لینے کے بعد اشوک نے نہایت ہی سادہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔ کالنگا کی جنگ کے بعد وہ جنگ کے بجائے امن کا علم بردار بن گیا تھا اور اُس نے مُلک کے بجائے دِلوں کو فتح کرنا اپنا اُصول بنالیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی اتنی وسیع سلطنت میں ہر طرف امن وامان کا دور دورہ تھا۔

اشوک کی توجّہ صرف بُدھ مت پھیلانے پر ہی نہیں تھی بلکہ اُس کی نظر اس بات پر بھی تھی کہ اِس میں غَلَط طریقے رائج نہ ہونے پائیں۔ بُدھ مت کے ماننے والوں میں یُوں تو گوتم بُدھ کی وفات کے ساتھ ہی اختلاف شروع ہو گیا تھا جسے

دور کرنے کے لیے بُدھ مت کے بھکشوؤں کی پہلی مجلس راج گر یہا کے مقام پر ہوئی تھی۔ اِس کا مقصد بُدھ کی تعلیمات کو اکٹھا اور محفوظ کر کے بُدھ مت کو انتشار سے بچانا تھا۔ اِس مجلس میں بُدھ کی تعلیمات اور اقوال کو دو کتابوں کی صورت میں مرتّب کیا گیا۔

پھر گوتم بُدھ کی وفات کے کوئی ایک سو سال بعد بُدھ بھکشوؤں کی ویسالی کے مقام پر ایک دوسری مجلس ہوئی۔ اِس مجلس کے نتیجے میں بُدھ مت کے ماننے والے دو گروہوں میں بٹ گئے۔

اشوک نے راج گدّی سنبھالنے کے اکیسویں سال میں پاٹلی پُتر کے مقام پر تیسری مجلس بلائی جس کی صدارت مشہور بھکشو موگالی پُترا نے کی۔ اشوک کے اثر و رسوخ کی وجہ سے یہ مجلس بُدھ کے پیروؤں کے اختلاف کو مٹانے میں خاصی کامیاب رہی۔ اِس مجلس میں جو نو ماہ تک جاری رہی، دور دراز سے بڑے بڑے راہب اور بھکشو شریک ہوئے اور اُنہوں نے بُدھ مت میں سے وہ تمام بُری

رسمیں نکال دیں جو اُس میں شامل ہو گئی تھیں۔

اور اِسی مجلس میں اشوک کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو اُس کے خیال میں بہت پہلے اِس دُنیا سے رُخصت ہو چُکا تھا۔ یہ شخص ابھی سار تھا جس نے اشوک کے باپ بُندوسار کے وقت میں ٹیکسلا میں بغاوت کی تھی، جو لڑائی کے میدان سے پُراسرار طور پر غائب ہو تھا اور جسے سارنگ بابا اور انوشا نے اُس کے قدموں میں لا ڈالا تھا، جسے اُس کے ہاتھی نے دریائے سندھ میں پھینک دیا تھا اور وہاں اُسے سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں ایک مگرمچھ نے ہڑپ کر لیا تھا۔

ابھی سار اب تک زندہ سلامت تھا۔ نہ صرف زندہ سلامت بلکہ کشمیر سے آنے والے ایک بھکشو کی حیثیت سے اِس مجلس میں شامل تھا۔

اشوک کے ذہن میں ابھی سار کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو اُس نے برسوں پہلے کہے تھے:

”یادرکھ! میری جان کا مالک تُو نہیں، وہ ہے جو تیری جان اور دوسرے انسانوں کی جان کا مالک ہے۔ وہ چاہے تو مُجھے زندہ رکھ سکتا ہے اور اُس وقت تک زندہ رکھ سکتا ہے جب تک تُو تلوار پھینک کر نیکی اور سچّائی کا دامن نہیں تھام لیتا“

اور ابھی سار کے ذہن میں سارنگ بابا کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے:

”تمہارا اور اشوک کا سامنا ایک بار پھر ہو گا، لیکن اُس طرح نہیں جس طرح تُم چاہتے ہو، بلکہ اُس طرح جس طرح قُدرت چاہے گی۔“

اور اُن کا سامنا پاٹلی پُتر کی مجلس میں اس انداز سے ہوا تھا کہ اشوک کے دِل میں ابھی سار کے لیے عزّت ہی عزّت تھی اور ابھی سار کے دِل میں اشوک جیسے رحم دِل راجا کے لیے احترام ہی احترام تھا۔۔۔ مگر اشوک ابھی سار کی جو عزّت افزائی کی، وہ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اُس نے کشمیر میں بُدھ بھکشوؤں کے آرام کے لیے ایک سو خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ یہی نہیں بلکہ ابھی سار کے نام پر ایک شہر بھی تعمیر کروایا جو بعد میں سری نگر کے نام سے مشہور ہوا۔

اشوک کے بعد

ناگیسن مہاراج کی کہی ہوئی باتیں اب میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔ اشوک کی کوششوں سے مہاتما بُدھ کا پیغام نہ صرف ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گونج رہا تھا بلکہ اس پیغام کی گونج لنکا، برما سیام، چین، جاپان، تبّت اور ہندو کش کے پار تک سُنائی دینے لگی تھی۔ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ لوگ شیش اور تکشک ہی نہیں، اندر، شِیو اور دوسرے دیوتاؤں کو بھی بھولتے جا رہے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ بُدھ مت کی بدولت ذاتوں کی اونچ نیچ مٹتی جا رہی ہے

اور برہمن اور شُودر ایک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ سب کُچھ اشوک کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

مگر یہ تصویر کا صرف ایک رُخ تھا۔ تصویر کا دوسرا رُخ اشوک کے آخری دِنوں میں اور خاص طور پر اُس کے مرنے کے بعد ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ کالنگا کی جنگ کے بعد اشوک نے لڑائی سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ اُٹھا لیا تھا۔ اِس لیے شاہی فوجوں کی طاقت بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ اشوک کے آخری دِنوں میں جب ٹیکسلا میں ایک بار پھر بغاوت ہوئی تو شاہی فوج اِس بغاوت پر قابو پانے میں ناکام رہی۔ ٹیکسلا کی دیکھا دیکھی اشوک کی وسیع سلطنت کے کئی سرحدی صوبے بھی آزاد اور خود مختار ہو گئے۔

اشوک نے تو اپنی تلوار ہمیشہ کے لیے نیام میں ڈال لی تھی، لیکن چالیس سال راج کرنے کے بعد جب وہ اِس دُنیا سے رُخصت ہوا تو اُس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اُس کے بیٹوں اور پوتوں کی تلواریں ایک دوسرے کے خلاف نیام سے نکل

آئیں۔ اشوک کے ایک بیٹے جلوک نے کشمیر اور قنوج پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ راج کُمار ویر سین نے اشوک کی زندگی ہی میں ٹیکسلا میں بغاوت کر دی تھی۔ اشوک کے مرنے کے بعد وہ ٹیکسلا اور دوسرے شمال مغربی سرحدی علاقوں کا آزاد اور خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ اشوک کے پوتے دسرتھ نے سلطنت کے مشرقی حصّے پر قبضہ کر لیا اور اُس کے دوسرے پوتے سمپراتی نے مغربی حصّے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

اشوک کے بعد پھیلنے والی اِس افراتفری میں سرحدی علاقوں اور ریاستوں کے حاکموں کی بن آئی۔ کالنگا اور آندھرا جیسی ریاستوں کو اشوک نے پہلے ہی کافی خود مختاری دے رکھی تھی۔ جب تک اشوک زندہ رہا، یہ ریاستیں اُس کی وفاداری کا دم بھرتی رہیں، لیکن اُس کے دُنیا سے رُخصت ہوتے ہی اِن ریاستوں نے آزادی کا اعلان کر دیا۔

اشوک کے کمزور جانشینوں کی وجہ سے موریہ سلطنت کی طاقت ختم ہو گئی تھی اور

مختلف سرحدی علاقے ایک ایک کر کے خود مختار ہوتے جارہے تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر وہ یونانی جنہیں چندر گُپت موریہ کی تلوار نے ہندوکش کے پار بھیج دیا تھا، ایک دفعہ پھر شیر ہو گئے اور سات دریاؤں کی سرزمین ایک بار پھر اِن یونانی حملہ آوروں کا نشانہ بننے لگی جو ہندوکش کے پار باختر اور پارتھیا کے علاقوں میں اپنی حکومتیں قائم کیے ہوئے تھے۔ اِن حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سات دریاؤں کی سرزمین باختر کے یونانیوں کے قبضے میں آگئی اور پھر اُن کی للچائی ہوئی نظریں بالکل اُسی طرح مگدھ کی طرف اٹھنے لگیں جس طرح کبھی سکندر اور اُس کے بعد سلیوکس کی نظریں مگدھ کی طرف اُٹھی تھیں۔ سات دریاؤں کی سرزمین تو اِس انقلاب سے گزر رہی تھی، اُدھر پاٹلی پُتر میں وہی خونی کھیل ایک بار پھر دہرایا جا رہا تھا جس کا تماشا راج محل کے در و دیوار اِس سے پہلے مہا پدم نند کے وقت کر چکے تھے۔ شِیش ناگ خاندان کے آخری راجا مہا نند کو اُس کے وزیر مہا پدم نند نے قتل کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا تھا اور اِس طرح نند خاندان کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور اب اشوک کے مرنے کے صرف پچاس سال بعد آخری موریہ راجا

برھادرتھ کو اُس کے وزیر پُشیامترا نے قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا تھا اور اِس طرح سُنگ خاندان کی بنیاد ڈال دی تھی۔

لیکن پشیامترا کے لیے مگدھ کی راج گدّی پھولوں کا بستر نہیں کانٹوں کی سیج تھی۔ جس طرح مہاراجا پورس کو سکندر سے مُقابلہ کرنا پڑا تھا، اِسی طرح ایک اور یونانی راجستھان، ایودھیا اور متھرا کو فتح کرتا ہوا پاٹلی پُتر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سکندر کی فوجوں نے تو دریائے بیاس سے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا مگر میناندر بیاس ہی نہیں، ستلج اور جمنا سے بھی آگے بڑھ کر دریائے گنگا کی وادی میں قدم رکھ چُکا تھا اور پوری وادی اُس کے گھُڑسواروں کی ٹاپوں سے گُونج رہی تھی۔ اُس کی کئی جھڑپیں ہو چُکی تھیں جِن میں پُشیا مِتر کو شکست اُٹھانی پڑی تھی مگر اُس کی خوش قسمتی نے اُس کا ساتھ دیا اور آخر کار کھارادیل بھی میناندر کی طرح شکست کھا کر واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔

پُشیا مِتر کی سلطنت کے جنوبی علاقے دریائے نربدا تک پھیلے ہوئے تھے اور اُس

نے اپنے بیٹے اگنی مِتر کو اُن علاقوں کا حاکم مقرّر کر رکھا تھا۔ اگنی مِتر نے اپنی پڑوسی ریاست وِدربھ (برار) کے راجا یوجین سین کو شکست دے کر اُس کا آدھے سے زیادہ علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا۔

اِن کامیابیوں سے متاثر ہو کر پُشیا مِتر نے اشومیدھ یگیہ یعنی گھوڑے کی قربانی کی رسم منانے کا اعلان کیا۔ اِس رسم کے مطابق ایک گھوڑے کو سلطنت کی حدوں سے باہر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ راجا کی فوج گھوڑے کے ساتھ ہوتی تھی۔ گھوڑا سال بھر تک جہاں چاہتا پھرتا رہتا اور یہ خیال کیا جاتا کہ دیوتا اِس گھوڑے کو ہانک رہے ہیں۔ جس جس علاقے میں بھی گھوڑے کے قدم پڑتے، راجا کی فوج اُسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیتی۔ اگر کوئی گھوڑے کا راستہ روکتا یا اطاعت قبول کرنے سے انکار کرتا تو اُسے راجا کی فوج کے ساتھ مُقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ایک سال پورا ہونے پر گھوڑے کو دارالحکومت میں واپس لایا جاتا تھا اور پھر مختلف رسموں کے بعد اُس گھوڑے کی قربانی دی جاتی تھی۔

اِس رسم کے لیے پاٹلی پُتر کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ نجومیوں کے مقرّر کیے ہوئے دِن اور وقت پر رسم شروع ہوئی۔ پنڈتوں نے گھوڑے کو پھولوں کے ہار پہنائے اور پھر بھجن گاتے ہوئے اُسے شہر کے سب سے بڑے دروازے تک لے گئے۔

دروازے کے پَٹ کھول دیے گئے اور گھوڑا ہوا کی طرح آزاد ہو کر گاؤں گاؤں بستی بستی پھرنے لگا۔ راجا پُشیا مِتر کی فوج اُس کے ساتھ تھی۔ پُشیا مِتر کا پوتا اور اگنی مِتر کا چھوٹا بیٹا واسو مِتر فوج کی کمان کر رہا تھا۔

گھوڑا جس علاقے سے بھی گزرتا، واسو مِتر اُسے اپنے دادا کی سلطنت میں شامل کر لیتا۔ راجستھان اور مالوہ تک کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی کہ شمال مغرب میں یونانیوں نے گھوڑے کا راستہ روکا۔ واسو مِتر مُقابلے پر آیا اور انہیں شکست دے کر بھگا دیا۔ اِس کے بعد گھوڑا گجرات اور دلبھی کی طرف بڑھا اور وہاں کے راجاؤں نے بغیر لڑے اطاعت قبول کر لی۔

پھر گھوڑے نے وِدربھا (برار) کا رُخ کیا۔ یہ وہی ریاست تھی جس کا راجا یو جین سین اگنی مِتر کے ساتھ لڑائی میں اپنا آدھے سے زیادہ علاقہ گنوا بیٹھا تھا، اور اب کہ گھوڑا واسو مِتر اور اُس کے سپاہیوں کو وِدربھا کے دروازوں پر لے آیا تھا تو انہیں یقین تھا کہ راجا یو جین سین اُس کا ہر قیمت پر مُقابلہ کرے گا، اور ہوا بھی ایسا ہی۔ جیسے ہی واسو مِتر اور اُس کے سپاہی دور جا کے قلعے کی طرف بڑھے، اُنہوں نے راجا یو جین سین کے سپاہیوں کو مُقابلے کے لیے تیّار پایا۔

لڑائی پورے زوروں پر تھی کہ واشو مِتر نے قلعے کے بڑے دروازے کی طرف نگاہ کی۔ اُس دروازے کے پاس ایک دُبلا پتلا نوجوان، سفید گھوڑے پر سوار بدِن پر زرہ بکتر سجائے اور سر پر خُود پہنے اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ واسو مِتر نے فوراً گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس نوجوان کے قریب پہنچ کر تلوار کا وار کیا۔ نوجوان نے واسو مِتر کا وار اپنی تلوار پر روک تو لیا لیکن تلوار اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ گئی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ سے زمین پر آ رہا۔ لوہے کا خُود اُس کے سر سے اُتر گیا اور لمبے لمبے بال اُس کے کندھوں پر بِکھر گئے۔ واسو

مِتر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جس نوجوان پر اُس کے وار کیا تھا، وہ مرد نہیں، لڑکی ہے۔ واسو مِتر نے فوراً گھوڑے سے چھلانگ لگا دی اور اُس لڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ لڑکی کے گھوڑے سے گِرتے ہی یو جین سین کے سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور وہ واپس قلعے کی طرف بھاگنے لگے تھے۔

جنگ کا طوفان تھما تو واسو مِتر لڑکی کی طرف متوجّہ ہوا جس کے بازو سے خُون بہہ رہا تھا۔ اُس نے لڑکی کو اپنے بازوؤں پر اُٹھا لیا۔ اُس کے سپاہی وِدربھا کے قلعے میں داخل ہو رہے تھے لیکن اُس نے خیمے کے بجائے اپنے خیمے کا رُخ کیا۔ خیمے میں پہنچتے ہی اُس نے لڑکی کے بازو کی مرہم پٹّی کرائی اور پھر اُسے خیمے کے ایک کونے میں لِٹا کر اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

ابھی لڑکی ہوش میں نہ آئی تھی کہ خیمے کے دروازے پر ایک سپاہی نمودار ہوا۔ وہ واسو مِتر کو بُلانے آیا تھا۔ کیونکہ قلعے میں اُس کا انتظار ہو رہا تھا۔ واسو مِتر نے نوکر کو لڑکی کی دیکھ بھال کرنے کی تاکید کی اور پھر قلعے کی طرف چل دیا۔

قلعے کے اندر راجا یوجین سین اپنی ریاست اور اُس کی دردناک تباہی پر غور کر رہا تھا۔ واسو مِتر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اُس کے قریب جا کر رُک گیا اور اُس سے پہلے کہ وہ کُچھ کہتا، راجا یوجین سین نے سر اُٹھایا اور اُسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

”واسو مِتر! میں جانتا ہوں کہ تقدیر نے تمہیں فتح دی ہے اور میرے ماتھے پر ہار کی کالک مل دی ہے۔ میں اگر بیمار نہ ہوتا تو شاید تقدیر کا فیصلہ کُچھ اور ہوتا۔ اچھّا جو قُدرت کی مرضی! مگر اِس سے پہلے کہ میں اپنی تلوار تمہارے حوالے کروں، میں مایا کا حال جاننا چاہتا ہوں۔“

”مایا؟“ واسو مِتر نے حیرت سے پوچھا۔

”میری بیٹی۔“ راجا یوجین سین نے جواب دیا۔ ”میری اکلوتی بیٹی۔ میری فوج کی کمان وہی کر رہی تھی، مردانہ لباس میں۔“

واسو مِتر نے کہا۔ ”وہ گھوڑے سے گِر کر زخمی ہو گئی تھی اور اِس وقت میرے خیمے میں ہے۔“

”راج کُمار! راج کُمار!“ ایک گھبرائی ہوئی آواز گُونجی۔

واسو مِتر نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سپاہی اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ واسو مِتر نے پوچھا۔

”مہا راج کُمار!“ اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”وہ لڑکی غائب ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہ مقدّس گھوڑا بھی غائب ہو گیا ہے!“

واسو مِتر یہ سُنتے ہی محل سے نکلا اور تیر کی طرح اپنے خیمے میں پہنچا۔ مایا کا کوئی پتا نہ تھا۔ وہ ملازم جسے اُس نے مایا کی دیکھ بھال پر مقرّر کیا تھا، خیمے کے ایک کونے میں بے ہوش پڑا تھا اور خیمے کے باہر پنڈت چیخ و پکار کر رہے تھے۔ اُن کے نزدیک

مقدّس گھوڑے کا غائب ہو جانا ایک بہت بڑا اشگون تھا۔ واسو مِتر کا حکم پا کر سپاہی اُسی وقت مایا اور گھوڑے کی تلاش میں چاروں طرف پھیل گئے۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چُکی تھی۔ واسو مِتر وِدر بھا کے قلعے کے سامنے والے میدان میں ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت سے ٹیک لگائے اپنی سوچوں میں کھویا ہوا کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے اُس کی پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ دس دِن ہو گئے تھے۔ لیکن راج کُماری مایا اور گھوڑے کا اب تک کوئی پتا نہیں چلا تھا۔

”اگنی مِتر کے بیٹے! تُجھے کیا دُکھ ہے جو اِتنی رات گئے اِس حالت میں یہاں کھڑا ہے؟“

یہ آواز سُن کر واسو مِتر نے چونک کر سامنے دیکھا۔ اُس سے دو قدم پر لمبے قد کا ایک جوگی کھڑا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی جٹائیں اور ناف کو چھوتی ہوئی سفید ڈاڑھی دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک ایسا لڑکا ہاتھ میں بین لیے کھڑا تھا جو سولہ سترہ سال سے زیادہ عُمر کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہم تھے، سارنگ بابا اور

انوشا جو ناگیسن مہاراج کے حکم پر اِدھر آئے تھے۔ واسو مِتر نے آگے بڑھ کر سارنگ بابا کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور کہنے لگا۔ ”مہاراج! میرے لیے کُچھ کیجیے۔“

”گھبراؤ نہیں، اطمینان سے سارا ماجرا کہو۔“

واسو مِتر نے ایک ہی سانس میں ساری کہانی کہہ ڈالی۔ وہ خاموش ہوا تو سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔ ”گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہیں اِس جنجال سے نکالنے کے لیے ضرور کُچھ کریں گے۔ ہم انوشا بیٹے سے کہتے ہیں۔ یہ تمہیں کھڑے کھڑے پُورب سے پچھّم اور اُترّ سے دکھن تک کی خبر لا سکتا ہے۔ آگ، پانی، ہوا اور مٹّی چاروں اُس کا حکم مانتے ہیں۔

”انوشا بیٹے! ذرا دیکھو تو، واسو مِتر کی مایا اور مقدّس گھوڑا کہاں ہیں؟“

سارنگ بابا کے اِن الفاظ کے ساتھ ہی مَیں نے محسوس کیا کہ ڈنڈک کے جنگل میں پہنچ گیا ہوں۔ جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں کو ہٹاتے ہوئے، میں آگے

بڑھ رہا تھا۔ ایک خاص قسم کی بُو میری رہنمائی کر رہی تھی۔

میں اِس بُو کی طرف یُوں کھنچا جا رہا تھا جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ پھر یکایک یہ بُو غائب ہو گئی اور اِس کے ساتھ ہی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ میرے قدم خُود بخود رُک گئے اور میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ میں درختوں کے درمیان ایک کھُلی جگہ میں تھا، اور اس کھُلی جگہ میں دو گھوڑے ایک دوسرے کو کاٹنے اور بھنبھوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک کُٹیا تھی۔ جس کے دروازے میں ایک بُوڑھا بیٹھا تھا اور اُس بوڑھے کے پاس ایک لڑکی بیٹھی تھی۔

دونوں گھوڑے تھوڑی دیر تک آپس میں لڑتے رہے اور پھر ایک گھوڑے نے دوسرے کی گردن کو اِس زور سے بھنبھوڑا کہ وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اِس کے ساتھ ہی بُوڑھے نے خُوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ ”شاباش میرے شیر! تُو نے میدان مار لیا!“ گھوڑے کو تھپکی دیتے ہوئے اُس کی نظر مُجھ پر پڑی۔ اُس نے

ایک دو لمحے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر پوچھا۔ ”تم انوشا ہو؟“

”ہاں مہاراج۔“ میں نے جواب دیا۔

”تُم پُشیا مِتر کے گھوڑے کی تلاش میں آئے ہو؟“

میں نے جواب دیا۔ ”اور راج کُماری مایا کی تلاش میں بھی۔“

”پُشیا مِتر کا گھوڑا وہ پڑا ہے۔“ بُوڑھے نے مرے ہوئے گھوڑے کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور راج کُماری مایا میرے پاس کھڑی ہے۔“

”اور آپ کون ہیں، مہاراج؟“

”میں کرشنا ستواہن ہوں۔ جس طرح پُشیا مِتر ترائی سے نربدا تک کا راجا ہے، اِسی طرح میرا بیٹا سری ست کارنی نربدا کے جنوب میں پُورب کے پانیوں سے پچھّم کے پانیوں تک کا راجا ہے۔ جس طرح پُشیا مِتر نے اشومیدھ یگ رچایا ہے، اِسی طرح میرے بیٹے سری ست کارنی نے اشومیدھ یگ رچایا ہے لیکن قُدرت کی

اَن دیکھی طاقتیں اِن دونوں راجاؤں کو آپس میں ٹکرانا نہیں چاہتی تھیں، اِس لیے وہ اِن کے گھوڑوں کو یہاں لے آئی ہیں اور اِن کے مُقابلے کا نتیجہ تُم دیکھ چُکے ہو۔“

”لیکن، آپ جانتے ہیں کہ یہ مقدّس گھوڑے ہیں اور ساری رسمیں ادا ہونے کے بعد ہی اِن کی قُربانی دی جاتی ہے۔“

”گھبراؤ نہیں بیٹے۔“ بُوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”قُدرت پُشیا مِتر کے رنگ میں بھنگ ڈالنا نہیں چاہتی۔ وہ اپنے گھوڑے کی قُربانی دے گا اور پُوری رسمیں ادا کرنے دے گا۔ اس لیے کہ قُدرت کا جو فیصلہ آج تُم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یہ آج کے لیے نہیں، کسی آنے والی کل کے لیے ہے۔ یہ کل نہ جانے کب آئے، مگر آئے گی ضرور۔ اب تُم آگے آؤ اور مہا تالی کی دُھن بجاؤ تا کہ میں تمہاری واپسی کا سامان تیّار کر سکوں۔“

یہ کہہ کر اُس نے سری ست کارنی کے گھوڑے کو ہاتھ کے اشارے سے ایک

طرف بھگا دیا اور مایا کا ہاتھ تھام کر مُردہ گھوڑے کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے بین پر مہا تالی کی دُھن چھیڑ دی۔ بُوڑھے کا ایک ہاتھ مُردہ گھوڑے کے جسم پر پھرنے لگا اور دوسرے ہاتھ سے اُس نے مایا کی نبض تھام لی۔ میں خاصی دیر تک بین بجاتا رہا۔ اچانک بُوڑھے نے ہاتھ اُٹھا کر مُجھے رُک جانے کا اشارہ کیا۔ اِس اشارے کے ساتھ ہی مُردہ گھوڑا ہنہناتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور مایا ایک بے جان لاش کی طرح زمین پر گِر پڑی۔

بُوڑھا کرشنا ستواہن کہنے لگا۔ "انوشا بیٹے، میں نے پُشیا مِتر کی خوشی کی خاطر مایا کی جان اِس گھوڑے میں ڈال دی ہے مگر یہ کام تمہاری مہا تالی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تُم اِن دونوں کو لے جاؤ۔ جب گھوڑے کی قربانی دی جائے گی تو مایا کی جان اُس کے جسم میں واپس آجائے گی۔"

میں نے بے جان مایا کا جسم اپنی پیٹھ پر لادا اور گھوڑا میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کئی دِن رات کے سفر کے بعد میں وِردبھا کے قلعے کے پاس پہنچا اور مایا کے بے جان

جسم کو پیٹھ سے اُتار کر زمین پر رکھ دیا۔ اِس کے ساتھ ہی سارنگ بابا کی آواز آئی۔

”اگنی مِتر کے بیٹے! لو، تمہاری مایا اور گھوڑا دونوں آ گئے ہیں۔“ میں یُوں چونکا جیسے ایک گہرے خواب سے جاگا ہوں۔ واسو مِتر میرے ہاتھ تھامے حیران حیران نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی چند قدم دُور کھڑے اُس گھوڑے کی طرف جو یُوں ہانپ رہا تھا جیسے ایک لمبا سفر طے کر کے آیا ہو۔

پھر وہ دوڑ کر گھوڑے سے لپٹ گیا۔ مگر جب اُس نے گھوڑے سے ہٹ کر مایا کو دیکھا تو اُس کا چہرہ بُجھ سا گیا۔

”یہ کیا؟ یہ تو ایسے لگتی ہے جیسے مر چکی ہو!“

سارنگ بابا کہنے لگے۔ ”تُو اِس کی فکر مت کر۔ یہ اُس وقت تک اِس حال میں رہے گی جب تک گھوڑے کی قُربانی کی رسم ادا نہیں ہو جاتی۔“

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ واسو مِتر کے پاٹلی پُتر واپس پہنچنے کے بعد گھوڑے کی قربانی دی گئی تو مایا یُوں آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے ایک گہرے خواب سے جاگی ہو۔ اور یوں یہ راز ہم تک ہی رہا کہ پُشیا مِتر نے جس گھوڑے کی قربانی دی تھی، وہ اصل میں اُس قُربانی سے پہلے ہی آندھرا کے راجا سری ست کارنی کے گھوڑے کے ساتھ مُقابلے میں مارا گیا تھا۔

گھوڑے کی قُربانی کے چند مہینے بعد ہی پُشیا مِتر اِس دُنیا سے چل بسا اور اُس کی جگہ اگنی مِتر نے سنبھالی۔

آٹھ سال حکومت کر کے اگنی مِتر بھی موت کی گود میں جا سویا اور اُس کا بیٹا واسو مِتر راج گدّی پر بیٹھا۔ اس کے مرنے کے بعد چار راجا اور آئے جو صرف نام کے راجا تھے۔ پھر جس طرح موریہ خاندان کے آخری راجا بریہادرتھ کو اُس کے سپہ سالار پُشیا مِتر نے قتل کر کے راج گدّی خُود سنبھال لی تھی، اِسی طرح سُنگ خاندان کے آخری راجا دیو بھوتی کو اُس کے سپہ سالار واسدیو نے قتل کر کے خود

مگدھ کی راج گدّی پر قبضہ کر لیا۔ یُوں پُشیا مِتر کا خاندان جس انداز میں شروع ہوا تھا اُسی انداز میں اپنے انجام کو پہنچا۔ مگر واسدیو اور اُس کے جانشین مُشکل سے چالیس برس راج کرنے پائے تھے کہ آندھرا کے ستواہنوں نے مگدھ پر قبضہ کر کے اُسے آندھرا سلطنت میں شامل کر لیا۔

آندھرا کے راجا بڑی آن بان والے تھے مگر چین سے راج کرنا اُن کی قسمت میں نہ تھا۔ اُنہوں نے مگدھ کی جس سلطنت پر قبضہ کیا تھا، وہ صرف گنگا کی وادی کے ایک حصّے تک محدود تھی۔ اگرچہ ہمالہ کی ترائی سے گوداوری کی وادی تک اُن کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا مگر پچھّم کی طرف ایک اور ہی طوفان اُٹھ رہا تھا۔ یہ طوفان ساکا اور کشان قوموں کے حملوں کا تھا۔ یہ وہ قبیلے تھے جنہیں اُن کے دُشمن قبیلوں نے سات دریاؤں کی سرزمین کی طرف دھکیل دیا تھا، اور اب یہ قبیلے یونانیوں کی طرح واپس جانے کا نہیں، اُسی سرزمین پر رہنے، جینے اور مرنے کا فیصلہ کر چُکے تھے۔ ساکا قوم کی تین مختلف شاخیں ٹیکسلا، متھرا اور مالدہ میں اپنی اپنی حکومت قائم کر چُکی تھیں اور آندھرا کے راجاؤں سے لڑائی کا خطرہ مول لے کر بھی اپنی

اپنی حکومت کی سرحدوں کو بڑھانے اور پھیلانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ اُن کے پیچھے کشان قبیلہ کابل کی وادی میں اپنے قدم جمارہا تھا۔

ہم نے آندھرا راجاؤں اور متھرا اور مالوہ کے ساکاؤں کو اُن کے حال پر چھوڑا اور سات دریاؤں کی سرزمین کا رُخ کیا۔ ٹیکسلا کے در و دیوار ایک بار پھر انوشا اور سارنگ بابا کو اپنی طرف بُلا رہے تھے۔